McGill University Library
3 102 905 827 N

This is a reproduction of a book from the McGill University Library collection.

Title: Shiblī kī rangīn zindagī
Author: Zubairī, Muḥammad Amīn, 1872-1958
Publisher, year: Lāhaur : Farū'q 'Umar Pablisharz, 1952

The pages were digitized as they were. The original book may have contained pages with poor print. Marks, notations, and other marginalia present in the original volume may also appear. For wider or heavier books, a slight curvature to the text on the inside of pages may be noticeable.

ISBN of reproduction: 978-1-77096-132-6

This reproduction is intended for personal use only, and may not be reproduced, re-published, or re-distributed commercially. For further information on permission regarding the use of this reproduction contact McGill University Library.

McGill University Library
www.mcgill.ca/library

MG1 .S5551z .Z93
INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES
52888
★
McGILL
UNIVERSITY

MINAR BOOK AGENCY
KARACHI-3

Shibli ki rangin zindagi

شبلی کی رنگین زندگی

Library
Institute of Islamic Studies JUN 15 1971

مؤلفہ

Zubairi

جناب مولوی محمد امین زبیری صاحب

ترتیب نو

جمیل نقوی

فاروق عمر پبلشرز - ۶، مال روڈ - لاہور

۱۹۵۲ء

اقبال بک ہاؤس ٹرام جنکشن صدر کراچی
فون: 77157

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

MG1
.S5551Z
.Z93

قیمت فی جلد
ایک روپیہ
(علاوہ محصول ڈاک)

فاروق عمر پبلشرز ۶ مال روڈ لاہور نے
اتحاد پریس بل روڈ لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

فہرس

عنوان	صفحہ
دیباچہ از جمیل نقوی مرتب	۴
عرض مؤلف	۵
مقدمہ اصول سوانح نگاری	۲۰
شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے مختصر حالات زندگی	۳۶
مولانا شبلی کی فطرت عشقی	۴۸
بمبئی کے سفر	۵۰
غزلوں کی مستی و حقیقت	۵۱
عطیہ بیگم کا سفر یورپ اور وداعیہ نظم	۶۲
واپسی کی مبارکباد اور خیر مقدم کی دو نظمیں	۶۳
مولانا کے جذبات کا تلاطم اور کمالات کا اعتراف	۶۵
جنجیرہ کا سفر اور تاثرات	۶۸
نمائش الہ آباد میں خاطر تواضع	۷۰
ناگواری	۷۱
عطیہ بیگم کی شادی اور مولانا پر اس کا اثر	۷۳
مولانا کی دو رباعیاں اور ایک قطعہ	۷۴
تصویر کی نسبت مولانا کا اشتیاق	۷۵
آخری زمانہ کی حسرت	۷۶
خاتمۂ داستان	۷۷
عطیہ بیگم کی تصریحات	۷۸
خاص احباب	۸۳
شبلی اور آزاد کے تعلقات	۸۳
مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی صدر یار جنگ	۹۰
چند اور خطوط بنام مہدی افادی	۹۵

دیباچہ

محتسب از پئے رجمے زحریفاں بہ کمیں
شبلیا! رندی پنہاں تو دشوار افتاد

ہم مشرقیوں کی عادت ہے کہ ہر چیز پر ایک پردہ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح ہماری چشم تصور کو ایک خیالی منظر پیدا کرنے میں زیادہ دلکشی نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اصل چیز کے خدوخال ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی بڑی ادبی شخصیت مثلاً حافظ، رومی، غالب، اقبال کا تعلق ہو تو یہ پردے کچھ اور بھی دبیز ہو جاتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نظروں تک ان تابناک ہستیوں کی ایک خاص وضع ہی کی جھلکیاں چھن چھن کر آئیں۔ اور ایسے عکس جو ہم ان سے وابستہ کرنا پسند نہیں کرتے نظروں سے پوشیدہ رہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کشش کسی شخصیت کی اصلی وضع میں ہوتی ہے اس کے کسی خیالی یا فرضی تصور میں نہیں ہو سکتی۔ اس طرح ہم اس کو ایک گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان کی حیثیت سے اسکی خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ایک حقیقت پرست کے لئے ایک خاص کیف رکھتا ہے۔

ای شبلی نعمانی ایں پردہ دری از چیست
اینہا کہ زخود گفتی من نیز خبر دارم

سوانح نگاری میں یہی مسلک سب سے زیادہ صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آخر ہمیں کیا اختیار ہے کہ جس طرح قدرت نے کسی فرد کو پیدا کیا ہے اس میں تغیر و تبدل کر کے ایک ایسا پیکر تراشیں جو ہمارے جمالیاتی احساس کی تشفی کرے۔ چنانچہ مغرب میں یہ روش بہت عام ہے کہ سوانح نگار جس شخصیت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تفصیل پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے خواہ وہ کیسی ہی بُری یا گھناؤنی کیوں نہ ہو۔ خود ہمارے سوانح نگاروں میں مولانا حالی ہی کو لیجئے جنہوں نے سرسید کے متعلق اُن کے عنفوان شباب کے لاابالیانہ مشاغل سے لیکر آخری عمر کی سنجیدہ سیاسی سرگرمیوں تک ہر چیز کو حتی الامکان قلمبند کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سرسید کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ان کے نام کی درخشندگی ماند پڑ جاتی ہے بلکہ اس سے تو ان کی طبیعت کے قدرتی نشو و نما پر روشنی پڑتی ہے۔ ہمارے مصنفین میں مولانا شبلی ایک خاص طبیعت کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں صحیح معنوں میں ایک شاعر، ایک رند پارسا پیدا کیا تھا۔ اُن کے ہر لفظ سے ان کا غیر معمولی جمالیاتی ذوق جھلکتا ہے۔ اب اگر ہم مولانا شبلی کی فطرت کے اس پہلو ہی پر نقاب ڈالدیں تو ظاہر ہے کہ حقیقی شبلی ہماری نظروں کے سامنے نہیں آسکتا۔ مصنف "حیات شبلی" نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک عظیم انسان تمامتر فضیلتوں ہی کا پیکر ہوتا ہے۔ شبلی کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ وہ محض ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے جس سے ہم مرعوب تو ہو سکتے ہیں لیکن اُسے دیکھکر کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔ اس مختصر کتاب میں مولانا شبلی کی زندگی کے اس رُخ کو

52888

سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جسے مصنف "حیات شبلی" نے احتراماً عام نظروں سے چھپانے کی کوشش کی ہے ؎

ہر چند غلط نسبت کہ شبلی دل دو بیں باخت
ایں حرف دلے مصلحت آمیز نہ بودہ است

"شبلی کی رنگین زندگی" کچھ ایسی رنگین نہ تھی جسے پیش کرتے ہوئے تکلف محسوس ہو۔ شبلی کی یہی فطرت عشقی تھی جس نے انھیں نہ صرف ایک شاعر رنگیں نوا ہی بنایا بلکہ ان میں وہ ولولہ، وہ جوش اور وہ گرمی پیدا کی جو اُن کی عظمت کی راز داں ہے۔

اس مختصر تذکرہ کی بنیاد کلیتاً ان خطوط پر ہے جو مولانا شبلی نے خاندان فیضی کی خواتین کو لکھے تھے۔ جوں جوں ہم ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ اُن کے ساتھ مولانا شبلی کو جو لگاؤ تھا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مولانا اپنے سابقہ خشک زاہدانہ ماحول سے نکل کر دفعتاً ایک زیادہ خوشگوار اور حیات افروز ماحول سے دوچار ہوئے جس نے ان کے خوابیدہ جمالیاتی احساسات کو بیدار کر دیا۔ ہم ان کے اس لگاؤ کو زیادہ سے زیادہ فلاطونی وضع کا معصوم عشق ہی قرار دے سکتے ہیں اور بس۔ اس کی تصدیق عطیہ بیگم کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو کہیں آئندہ صفحات میں نقل کیا گیا ہے۔ بہر حال ؎

شبلیا نابلد کوچۂ عشقیم ولے
دوستاں تہمت ایں شیوہ بما نیز کنند

جمیل نقوی

ندوہ
لکھنؤ
۲۰ اپریل سنہ ۱۹ء

عزیزی

الوداع

وداعیہ نظم پہنچی ہوگی جانے سے پہلے ایک خط جس میں
روانگی کی تاریخ اور وقت متعین ہو آنا چاہیے
نظم کی رسید بھی اچھا خدا حافظ

میروی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشین! کہ باران بگذرد

شبلی

عرضِ مؤلّف

میں نے ۱۹۴۶ء میں تبصرہ حیات شبلی (شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو) ایک کتابچہ شائع کیا تھا اس میں جو واقعات تھے ان کے متعلق تو شبلی اسکول کے منتہی یا دارالمصنفین کے ارکان ایک لفظ نہ کہہ سکے البتہ میرے خلاف ایسے حربے استعمال کئے جو کھبا نوچے کے مترادف ہیں۔ قبل ازیں کہ میں آگے بڑھوں مناسب ہے، کہ ان تعلقات کا جو میرے اور مولانا شبلی مرحوم، علامہ سیّد سلیمان اور دارالمصنفین کے رہے۔ مختصر تذکرہ کردوں جو ناظرین کو رائے قائم کرنے میں مدد دے گا۔

مولانا کے ساتھ میرے نیاز مندانہ تعلقات ۱۹۰۷ء سے اور علامہ سید سلیمان کے ساتھ ۱۹۱۰ء سے جبکہ وہ ندوہ کے طالب علم تھے شروع ہوئے، میں اس وقت بھوپال میں مہتمم دفتر تاریخ یعنی علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم فرمانروائے بھوپال کی روبکاری کا ایک

عہدہ دار تھا۔ میرے فرائض مثل ایک لٹریری اسسٹنٹ کے تھے
انہی فرائض کے سلسلہ میں بے ضابطہ طور پر بیرون بھوپال کے قومی و
علمی امور بھی تھے، میں نے اپنی اس حضوری اور فرائض عائدہ کے
سلسلہ میں مولانا شبلی کے مقاصدِ علمی خصوصاً ندوہ اور تالیف
سیرت النبی صلعم کے متعلق چند خدمات انجام دیں جن کا کچھ اندازہ
مکاتیبِ شبلی حصہ اول سیرت النبیؐ اور سیرت عائشہ کے دیباچوں
سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کی رحلت کے بعد دارالمصنفین کے استحکام
اس کے اوّلین ضوابط کی ترتیب اور دیگر اخلاقی امدادوں کے لحاظ
سے مجھے اس کا رُکن منتخب کیا گیا، یہ وہ تعلقات تھے جو بہت ہی کم
لوگوں کے تھے۔

مجھے بھوپال کے توسل سے ہی سنہ ۱۹۱۰ء میں خاندان فیضی کی
بیگمات سے تعارف حاصل ہوا پھر مسلسل مواقع ملاقات ہم سفری، اور
ماہنامہ ظل السلطان کی اشاعت کے باعث روابط خصوصی ہو گئے۔

سنہ ۱۹۲۳ء یا سنہ ۱۹۲۴ء میں بمقام بمبئی جب ان کے ایوانِ رفعت
میں میری ملاقات ہوئی تو کمرۂ ملاقات میں مولانا شبلی کی تصویر، جو
عطیہ بیگم صاحبہ کے شوہر مسٹر رحمین فیضی کے مصوری کے کمال فن کا
نمونہ تھی ایک نمایاں موقع پر آویزاں تھی۔ اس کو دیکھ کر ہماری گفتگو کا
اہم موضوع مولانا شبلی کی شخصیت بن گئی جو ہم سب کے ممدوح تھے۔
اثنائے گفتگو میں بیگم فیضی صاحب موصوفہ نے مولانا کے خطوط کا بھی ذکر کیا

جوان کے اور انکی بڑی بہن زہرہ بیگم فیضی کے نام مولانا نے لکھے تھے، مجھے ان کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور عطیہ بیگم صاحبہ نے اپنے آہنی سیف سے نکال کر عنایت کئے تھوڑے سے وقت میں سب کا پڑھنا ممکن نہ تھا میں نے بہ اصرار اپنے جائے قیام پر لانے اور نقل کرنے کی اجازت لی اور یہ خیال کیا کہ مکاتیب شبلی کی اشاعت بار ثانی میں اگر ان کو شامل کیا جائے گا تو مجموعہ کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ بہرحال اپنے جائے قیام پر ان کو بہ اطمینان پڑھا تو ایک ادبی سرور پیدا ہو گیا۔ اور پھر بار بار پڑھا، نقل کرائی اور بھوپال واپس آکر ایک نقل علامہ سید سلیمان کے پاس بھیجدی مگر انہوں نے یہ لکھ کر کہ دار المصنفین متحمل نہیں ہو سکتا واپس کر دی، اس عرصہ میں بعض خطوط ماہنامہ ظل السلطان میں بھی شائع ہوئے اور چند دوستوں نے جن کو ادبی مذاق تھا سب کو پڑھا اور سب ہی نے اس کی اشاعت پر اصرار کیا۔ مولوی عبد الحق معتمد انجمن ترقی اردو نے تو اس مجموعہ پر ایک فاضلانہ اور ادیبانہ مقدمہ بھی لکھا اور یہاں تک لکھدیا کہ "اگر یہ خطوط نہ چھپے تو اس کا الزام آپ کے سر رہے گا، اور اردو زبان کی عدالت میں آپ سب سے بڑے مجرم سمجھے جائیں گے"۔ غرض یہ مجموعہ مع مقدمہ شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔

مجموعہ میں ۵۴ خط عطیہ بیگم صاحبہ کے نام ہیں اور ۴۵ زہرہ بیگم صاحبہ کے نام۔ چند اردو فارسی نظمیں بھی ہیں جو کلیات شبلی میں نہیں۔ ان میں کوئی بات اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اخلاقی ابتذال کہی جا سکے۔ یا اس

سے دوسرے مطالب و معانی اخذ کئے جاسکیں۔ بجز اس کے کہ بعض خطوں میں ایک ادیبانہ قسم کی شوخی ہے، قابلیت کے اعتراف ہیں اور عزیزانہ تعلقات کا اظہار، لیکن اس مجموعہ خطوط کی اشاعت کے بعد ہی مکاتیب شبلی کو بہت سے مکاتیب کے اضافوں کے ساتھ علامہ سید سلیمان نے ایک مقدمہ لکھکر دو حصوں میں شائع کیا۔ ان میں جو مکاتیب مرحوم مہدی حسن افادی کے نام کے ہیں وہ عطیہ بیگم صاحبہ کے بعض خطوط کی تشریح ہیں اور نہ یہ بلکہ ان میں مولانا اتنے کھل کھیلے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، پھر یہی مکاتیب نہیں بلکہ ابوالکلام آزاد کے نام کے مکاتیب نے تو انہیں بالکل عریاں کردیا ہے۔ بعض تلامذہ کے نام بھی ایسے مکتوب ہیں جو اچھے اخلاق کی تعلیم نہیں دیتے، اور جن سے مولانا شبلی علمی رفعت و بلندی سے اخلاقی ابتذال کے پست سطح پر آجاتے ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کریں کہ ایسے خطوط کی اشاعت مرتب مکاتیب کی عقلی نارسائی اور قوت تمیزی کے فقدان کی دلیل ہے یا اپنے محسن سے کسی کینہ دیرینہ کا انتقام ہے[1]۔

---

[1]:۔ علامہ سید سلیمان اور ان کے رفقا نے سیرۃ النبی صلعم کی متعدد جلدوں کو مرتب کیا ہے۔ اس سیرت کی بڑی خوبی یہی متصور تھی کہ روایات کی تنقید اور تحقیق علی وجہ الکمال کی جائے گی اور درایت کا جہاں تک تعلق ہے۔ ایک نمونہ ہوگی مگر ان مکاتیب کی ترتیب و اشاعت اور حیات شبلی کی تالیف میں روایات و تاویلات بارد کی کثرت نے بلاشبہ یہ ضرورت پیدا کردی ہے کہ علمائے کرام تنقیدی و تحقیقی طور پر ان جلدوں کا جائزہ لیں۔

اردو ادب میں شخصیتوں، شاعروں اور ادیبوں پر مقالہ نگاری غالباً اس صدی کی ادبی ترقیوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مقالہ نگار عموماً شاعروں کی نظموں سے اس کے دل کی گہرائیوں کو ناپتے اور اس کے اخلاق و کردار کو پرکھتے ہیں اور ادیبوں کو ان کے خطوط کی روشنی میں دیکھتے اور اسی پر رائے قائم کرتے اور جانچتے ہیں۔

ایسے مقالہ نگاروں سے شبلی کا بچنا ممکن نہ تھا ان کا کلیات بھی موجود تھا اور ان کے مکاتیب کے مجموعے بھی، ایسے مقالوں کی نسبت جہاں تک مجھے علم ہوا سب سے اول ۱۹۳۴ء میں اندھیری کالج بمبئی کے پروفیسر سید نجیب اشرف ایم، اے ندوی نے شبلی اور بمبئی کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا اور شبلی کے محرکات غزل پر روشنی ڈالی، پھر کاٹھیاوار کے مشہور ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے جو دارالمصنفین سے بھی رابطہ رکھتے ہیں "علامہ شبلی بہ حیثیت شاعر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں دکھایا کہ بمبئی کے خاندان فیضی کے بعض افراد (صنف نازک) کا ان پر اثر پایا جاتا ہے[۵]۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں مشہور افسانہ نگار سلطان حیدر جوش نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک تقریر نشر کی اور اس کا عنوان

۵:۔ ندوی صاحب اور قاضی صاحب کے مقالے میری نظر سے نہیں گذرے۔ ان دونوں صاحبوں نے اپنے مقالوں کی نسبت مجھے خطوں میں جو کچھ لکھا اسی کو میں نے لکھا ہے۔

"شبلی کی شخصیت خطوں کے آئینہ میں" رکھ کر مولانا کے قلبی ہیجان کی جان عطیہ بیگم کو قرار دیا۔ پھر رسالہ کتاب لاہور میں وحید قریشی صاحب نے ایک مبسوط مقالہ شائع کیا، اور ماہنامہ نگار لکھنؤ میں بھی مباحثہ کا دروازہ کھل گیا۔

ان تمام مقالوں اور مباحثوں میں بیگمات فیضی ہی نمایاں کی گئیں، میں نے اپنا فرض خیال کیا کہ ان کی پوزیشن صاف کردوں کیونکہ میں نے ہی خطوط شبلی شائع کئے تھے۔ اس لئے ۱۹۴۶ء میں ایک مختصر کتابچہ شائع کیا جس کے دیباچہ میں شبلی کی طرف سے معذرت بھی تھی۔ ارباب دارالمصنفین متذکرہ مقالہ نگاروں کے مقالوں پر تو خاموش رہے لیکن میرے مقابلہ میں ایک حربہ استعمال کیا اور وہ ہی ایک حربہ ان کے قبضہ میں تھا۔ جب سے دارالمصنفین قائم ہوا اب تک مجھے اس کی رکنیت کی عزت حاصل تھی اور یہ ہی عزت تھی جو مجھ سے واپس لی جاسکتی تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی مدیر "صدق" جو ایک نہایت نیک اور کریم النفس اور میرے عنایت فرما بھی ہیں ان سے حسب ذیل تحریک پیش کرائی گئی:۔

> "منشی محمد امین صاحب زبیری کا تازہ پمفلٹ حیات شبلی پر تبصرہ آپ کی نظر سے گذر چکا ہوگا۔ منشی صاحب غالباً ارکان دارالمصنفین میں سے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جو صاحب بانیٔ دارالمصنفین کی اس درجہ

تفضیح و تنقیص و تضحیک پر تُل جائیں انہیں کوئی
حق بھی ایسے ادارہ کی ممبری کا باقی رہتا ہے میرے
خیال میں تو ان بزرگ کو اس خدمت سے
سبکدوش ہی فرمایا جائے۔"

یہ تحریک (جو اغلباً اور خیال سے مرصع ہے) بہ تائید مولوی مسعود علی ندوی ارکان کے پاس بھیجی گئی اور اس شکیہ کے ساتھ کہ تبصرہ نظر سے گذر چکا ہوگا، سات ارکان نے مزید تائید کی۔

ایک عالم جناب مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی نے تائید میں لکھا کہ "منشی محمد امین صاحب اپنی اس کتاب کے بعد دار المصنفین کیا کسی مہذب سوسائٹی اور جماعت میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہے۔"

ایک ندوی عالم مولوی عبد الباری نے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ
"بانی دار المصنفین کیا معنی ایسی تفضیح و تضحیک تو کسی عام مومن کی بھی معصیت ہے اور ایسے بزرگوں کا دار المصنفین کا رکن کیا معنی اسلامی جماعت میں رہنا بھی شرمناک ہے۔"

حاجی رشید الدین لکھتے ہیں کہ "ان کا نام ممبری سے جلد از جلد خارج ہونا چاہیئے۔"

غرض چار دیگر ارکان نواب صدر یار جنگ، حبیب الرحمان خاں شروانی، نواب مہدی یار جنگ، ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوہ

مرزا سلطان احمد کلکٹر کھیم پور کھیری نے بھی تائید کی۔ البتہ پروفیسر نواب علی صاحب ایم، اے۔ سابق وزیر تعلیم جوناگڑھ نے اختلاف کیا مختصر یہ کہ مجلس کارکن نے حسب ذیل قرارداد منظور کی:۔

"منشی محمد امین صاحب جو چند سال سے دار المصنفین سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں لیتے بلکہ بانی دار المصنفین کے خلاف ایسے رویہ کے مرتکب ہو رہے ہیں جو دار المصنفین کے مصالح کے خلاف ہے، اس لئے یہ تحریک مولوی عبد الماجد صاحب بہ تائید مولوی مسعود علی ندوی و بمنظوری اکثریت ارکان انتظامی ان کا نام رکنیت سے خارج کیا گیا۔"

اب ذرا اس عالمانہ طریق کار پر بھی نظر فرمائیے کہ ۱۷ مارچ ۱۹۴۷ء سے پہلے جس دن اور جس وقت یہ قرارداد منظور ہوئی راقم قاعدہ کے مطابق رکن تھا اور راقم کے پاس بھی ایجنڈا بھیجنا ضروری تھا لیکن نہ تو ایجنڈا بھیجا گیا اور نہ قرارداد کی اطلاع دی گئی، خارجی اطلاع پر جب درخواست کی تو دو مہینے انتظار کے بعد کارروائی کی نقول حاصل ہوئیں۔

مجلس کارکن کا شکر واجب ہے کہ اس نے مولانا عبد الماجد صاحب کی تحریک جس کی (۷) ارکان نے تائید کی تھی بجنسہ منظور نہیں کی اور نہ میرے تبصرہ کو تفضیح و تضحیک اور تنقیص قرار دیا بلکہ دار المصنفین کے مصالح کے خلاف قرار دیا۔

میرے بعض احباب نے اپنے خطوں میں بہت کچھ اخلاقی وعظ بھی فرمائے اور "اُذْکُرُوْا مَوْتٰکُمْ بِالْخَیْرِ" پر بھی زور دیا۔ اور زیادہ تر زور اس بات پر دیا کہ سوانح میں صرف پبلک لائف پر بحث ہونی چاہیئے پرائیوٹ لائف سے اعراض و قطع نظر کرنی چاہیئے۔ مکرم قاضی احمد میاں اختر لکھتے ہیں کہ "یہ صحیح ہے کہ حیات شبلی مولانا کے اصول مبینہ کے خلاف لکھی گئی ہے اور یہ کہ اس میں تمام تر ان کے محاسن دکھائے گئے ہیں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے مشرق میں کسی کے سوانح حیات لکھنے کا مقصد ہی عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس کے محاسن و کمالات دکھلائے جائیں۔ اس کی زندگی کے تاریک یا بقول آپ کے رنگین پہلو سے عموماً اغماض کیا جاتا ہے۔ دنیا کی مشہور سوانح عمریاں اور تذکرے بالعموم معتقدانہ رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے کہ مقصد اصلی ان مشاہیر کے کارنامے دکھانے اور دنیا سے ان کو واقف کرنا ہے، حیات جاوید اور حیات النذیر پر مولانا شبلی کا اعتراض ایک طرح کی معاصرانہ چشمک سے زیادہ نہیں ورنہ خود مولانا کے لکھے ہوئے سوانح اسی اصول پر لکھے گئے ہیں[۵۱]"۔

ایک فقرہ میں ارشاد ہے کہ

---

۵۱ :۔ المامون میں تو مولانا نے مامون الرشید کی رنگین زندگی کی پوری تصویر پیش کی ہے۔ الفاروق، سیرۃ النعمان اور سوانح مولانا روم میں ایسا کوئی رنگ مل ہی نہیں سکا۔ "شعر العجم" کے بعض تذکروں میں تو حد ہی کر دی ہے۔

"دوسری طرف ابوالکلام کا ذکر کرکے علامہ مرحوم کو ایک حد تک اسکروائلڈ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کسی طرح مستحسن نہیں، کہی جاسکتی۔ مولانا کی یہ تحریر کہ" اس فرد جرم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے، صرف امر واقعہ کا اظہار ہے اور معترضین کے اتہام کی تردید پھر خود ابوالکلام کی تحریر نقل کرکے اس سے جو مطالب پیدا کئے گئے ہیں وہ تمام تر سوء ظن پر مبنی ہیں جو ظن المومنین خیرا کے خلاف ہیں۔" ایک نہایت قابل، محترم اور عزیز ہستی خواجہ غلام السیدین نے لکھا کہ

"آپ کی تحقیق اور جستجو میں کیسے کلام ہوسکتا ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے حالات کا خیال کرتے ہوئے اس سے ناگواری اور تنازعہ پیدا ہونے کا امکان ہے حالانکہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے داخلی شہادت پر ہی اکتفا کیا ہے مگر ابھی تک ہندوستان کی ادبی تنقید میں محض ذاتی امور کو شامل نہیں سمجھا جاتا۔"

ان مواعظ و نصائح اور اندیشوں کا جواب تو ہم نے اصول سوانح نگاری کے متعلق جو مقدمہ لکھا ہے اس میں مولانا حالی، مولانا شروانی اور دونوں سے زیادہ تفصیلی خود مولانا شبلیؒ کی زبان سے ملے گا[۱]۔ تاہم اگر اختر صاحب سے یہ سوال کیا جائے کہ آپ نے اپنے مقالہ میں شبلی کے

---

[۱]:- مزید جواب کے لئے اموی و عباسی اور دیگر خلفا کی تاریخیں جو متقی اور ثقہ اصحاب نے لکھی ہیں۔ ملاحظہ کی جائیں۔

ادبی اور شاعرانہ مشاغل پر بمبئی کے بعض افراد (صنف نازک) کا اثر بیان کرکے کیوں ان کے اور شبلیؒ کے تعلقات اور تعلقات کی نوعیت کا کھوج لگانے کی دعوت دی اور کیوں اپنے ظن و قیاس میں صنف نازک کا احترام ملحوظ نہ رکھا۔ حالانکہ صنف نازک کا احترام مذہباً واجب ہے، تو کیا جواب ہوگا۔

ابوالکلام اور شبلی کے تعلقات میں خود مولانا کے خطوط جو علامہ سید سلیمان نے مکاتیب میں شائع کئے ہیں اور ابوالکلام کے خود نوشت تذکرہ سے وہ فقرات جن میں انہوں نے اپنی زندگی کی جھلکیاں دکھلائی ہیں پیش کئے گئے ہیں۔ البتہ راقم تبصرہ نے ابوالکلام کی تصویر سے ان کی سادہ رخی کو ضرور دکھایا ہے۔ اگر مولانا اس طرح خود بخود آسکر وائلڈ بن جاتے ہیں تو راقم کا قصور نہیں، یہ کوشش تو شائع کنندہ مکاتیب اور خود ابوالکلام کی طرف منسوب کرنی چاہیئے۔ جب شبلی کے سوانح نگاری کے اصول پر مولوی عبدالباری اور مولوی مناظر احسن گیلانی کو متوجہ کیا گیا تو اول الذکر نے تو اسی اخلاقی وعظ و پند کو سپر بنایا اور کسی مرحوم کے معاصی و فواحش کا اعلان شرعاً ناجائز و گناہ خواہ کسی کی زبان و قلم سے ہو بتاتے ہوئے اپنا طبعی احساس جتا کر اپنی تائید کے لفظ شرمناک کو واپس لیا مگر آخر الذکر نے جواب دیا کہ انہی چیزوں کو پیش کرکے وہ ہی سوال جو آپ کے متعلق کیا گیا تھا اگر مولوی شبلی مرحوم کے متعلق بھی کیا جاتا تو اس کا جواب بھی غالباً میری طرف سے وہ ہی ہوتا جو آپ کے متعلق خاکسار کی طرف سے دیا گیا۔۔۔۔ جو کچھ آپ نے اب تک ان کے متعلق لکھا ہے یا آپ کے سوا دوسروں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا

ہے شاید یہ گنبد کی صدا ہے جیسی کہے ویسی سنے کہ کرد کہ نیافت، جو کچھ مولوی صاحب نے بویا تھا وہ ہی فصل اوگی ہے اس کو اب وہ کاٹ رہے ہیں شاید قدرت کا یہ انتقام ہے"۔ ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ شبلی صرف ایک مؤرخ، ادیب، متکلم اور فاضل علوم قدیمہ تھے ان میں تورّع نہ تھا اور نہ ثقاہت، اور بقول مولوی محمد اسلم جیراجپوری "لیکن علوم صرف ان کے دماغ کو منوّر کر سکے تھے دل کی گہرائیوں تک ان کی روشنی بہت کم پہنچی تھی"۔ خود مرتب حیات شبلی نے تسلیم کیا ہے کہ ان کا طریق زندگی عالمانہ نہیں تھا، اس لئے اگر ان میں اس قسم کے جذبات اور ایسے حالات پیدا ہوئے جو خطوط و مکاتیب میں نمایاں ہیں تو ان پر پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے اور جب ان کے واقعات زندگی مرتب ہوں تو ان کا اخفا کیا معنی، آخر وہ بھی تو زندگی کے ہی واقعات ہیں۔

حیات یا سیرت میں عموماً خانگی حالات، ازدواج و اولاد، اخلاق و عادات مشاغل و احباب سے حتےٰ کہ ماکولات و مشروبات اور سونے جاگنے تک کے اوقات کا بیان کتاب کے آخری حصہ کا دلچسپ باب ہوتا ہے۔ ان سب کا پرائیویٹ واقعات و حالات سے ہی تو تعلق ہے اس لئے اگر صاحب سوانح کی نفاست پسندی کے ساتھ حسن پرستی کا ذکر کیا جائے تو کیا الزام ہو سکتا ہے۔

عشق اور حسن سے متاثر ہونا فطرت انسانی میں داخل ہے اگر صاحب سوانح عشق میں مبتلا ہو اور ۵

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور سیرت و حیات میں اس کا ذکر کیا جائے تو کیونکر معصیت ہے۔
عشق کی پاکیزگی تو یہ ہے کہ من عشق وعف وکتم ومات مات شہیدا
اور ابتذال یہ ہے کہ اپنے عشق کو طشت از بام کرتا پھرے ؎

عشق عصیاں است گر مستور نیست
کشتۂ تیغ زباں مغفور نیست

اگر یہ مباحث پیش نہ آتے تو میں اب خاموشی اختیار کرتا لیکن اپنی صفائی اور بیگمات کے احترام کے لحاظ سے اس تبصرہ کو اضافہ و ترمیم کے ساتھ مکرر شائع کر رہا ہوں۔ میں نے مقدمہ میں اصول سوانح نگاری کو پیش کیا ہے۔ پھر مولانا شبلی کا خلاصہ زندگی (لائف اسکیچ) لکھ دیا ہے۔ سفر بمبئی اور خاندان فیضی سے تعلقات، عطیہ بیگم صاحبہ کی تصریحات ابوالکلام آزاد اور شبلی کے مراسم نواب صدر یار جنگ۔ موثق حیات شبلی کی منوط زندگی اور مہدی افادی کے نام کے چند خطوط غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ پھر ناظرین نتیجہ نکالیں خود شبلی کی پیشگوئی تھی کہ

سالہا زمزمہ اہل جہاں خواہد بود
کیس نوا ہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام

محمد امین زبیری

مقدّمہ

اُصولِ سوانح نگاری

اردو زبان میں گذشتہ صدی سے سوانح نگاری بھی اربابِ قلم اور اہلِ ادب کا خاص موضوع ہو گیا ہے۔ چنانچہ اکابر سلف اور ہم عصر اعاظم الرجال کی متعدد سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم عصروں کی سوانح عمری لکھنے کا تعلق ہے اس کا شوقِ حیاتِ جاوید (سرسید کی سوانح عمری) نے پیدا کیا اور لکھنے والوں کو ایک خاموش معلّم کی حیثیت سے سوانح عمری لکھنے کا سلیقہ سکھایا لیکن ہر انسان کی زندگی میں انبیا کو مستثنیٰ کر کے اچھائیوں کے ساتھ کچھ بُرائیاں بھی ہوتی ہیں۔ روشن پہلو کے بالمقابل تاریک پہلو بھی ہوتا ہے اور سوانح نگار کی نظر ان دونوں پہلوؤں پر جاتی ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی سوانح میں ایک پہلو کو چھوڑ دیا جائے تو وہ سوانح عمری مکمل کہلانے کی مستحق ہوتی ہے یا نہیں۔

مسلمان مورخین نے اوائلِ اسلام سے ہی تاریخ و تذکرہ اور

ترجمہ میں جن لوگوں کے حالات لکھے ان کے مناقب و مثالب کے بیان میں صداقت و بے باکی اور آزادی سے کام لیا اور ان کے نزدیک جو باتیں نکتہ چینی کے قابل نظر آئیں انہیں شخصی عظمت و تقدس سے مرعوب ہو کر نظر انداز نہیں کیا۔

فقہا و محدثین اور علمائے رجال نے تو عالمانِ دین کی زندگی کے تاریک پہلو بھی دکھلانے میں باک نہیں کیا۔ تمام اسلامی صفات کے ساتھ مسلمان سلاطین میں اورنگ زیب عالمگیر کا جو مرتبہ تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مغل سلاطین میں صرف اسی کی ذات ہے جس کو رحمتہ اللہ علیہ کی دعا سے یاد کیا جاتا ہے مگر عالمگیر کے عالم شباب کا یہ واقعہ صفحات تاریخ میں نمایاں ہے کہ جب وہ صوبہ داری دکن کا جائزہ لینے اورنگ آباد جا رہے تھے تو برہان پور کے مقام پر اپنی خالہ کے محل میں زین آبادی (ہیرا بائی) کے تیرِ ادا کا شکار ہو گئے اور باوجودیکہ ہیرا بائی ان کے خالو سیف خاں کی حرم تھی اس کو حاصل کر ہی لیا۔ مورخین نے اس واقعہ کو عالمگیر کے عظمت و تقدس کے لحاظ سے محو نہیں کیا گیا۔ اس لئے اگر کوئی سوانح عمری اس اصول سے معرّا ہو تو اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔

مولانا حالی نے حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"اگر ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرٹیکل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے

ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔"

اس کے بعد صاحب سوانح سرسیدؒ کے متعلق ریمارک کر کے لکھا کہ

"ایسے شخص کی لائف چُپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضرورت ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھراپن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے۔"

چنانچہ ان کی عنوانِ شباب کی رنگین زندگی، لبسنت کے جلسوں اور نغمہ و سرود کی محفلوں میں شرکت اور بالآخر ایک معاشقہ کا بھی بیان ہے۔

تاہم مولانا شبلی نعمانی جو اس زمانہ میں تاریخ کے زبردست معلّم مانے

گئے ہیں حیات جاوید کی نسبت ایک خط میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ

"حیات جاوید میں مولانا (حالی) نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق علمی اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے سوائے اس کے کہ وہ دعوی کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال میں حیات جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔"

ماثر رحیمی کے ریویو میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخانان کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آجکل کے اس پُرفریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعوے کرکے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کرکے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کو یقین کرانے میں کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔"

موازنہ انیس و دبیر میں بھی لکھا ہے کہ

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعوئے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں جس چیز نے اُنہیں اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا بعیات النذیر کے ریویو میں ایک چبھتا ہوا فقرہ لکھا ہے کہ

"سوانح نگاری کا آج کل جو طرز ہے وہ ایک قسم کی وکالت کے درجہ تک پہونچ گیا ہے"

مولانا اپنے اس اصول میں اتنے سخت ہیں کہ مناقب عمر بن عبدالعزیز تک کے تبصرہ میں لکھا کہ :-

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے مصنفین اسلام آج کل کے فریب وہ طریقوں سے بالکل آشنا نہ تھے آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ لیکن

اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیئے جاتے ہیں جس سے دراصل مداحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے، اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی۔ یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے اُردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض اور خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا جرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خداعی ہے جو واقعہ نگاری سے بمراحل دور ہے۔"

پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر صحابہ کرام کے حالات زندگی تک اس اصول کو وسیع کر دیتے ہیں۔

"صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلو کو لیجئے اور ان پہلوؤں کو صاف دکھائیے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔"

خود مرحوم مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) جو اس دور میں صف اول کے مشاہیر فضلا و ادبا میں تھے اپنی

تنقید حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ

"اگر قوم کے ذہن نشین نہ ہو کہ اس میں کچھ آہنی قلم ایسے بھی ہیں جو بخلاف مصوّر کے موقلم کے ظاہری امور کی تہ میں پہونچنے اور فاسد مادّہ کے موقع پر نشتر بن کر اندر پیر جاتے ہیں اس وقت تک قوم سیدھی نہیں چل سکتی ....."

"حیف ہے کہ اگر لوہے کا قلم موقلم بن جائے اور نشتر کے موقع پر موآمیزی کرنے لگے ..... لائف تاریخ کا جزو ہے۔ تاریخ کے کیا معنی ہیں واقعات کی حکایت اور جو کچھ واقعہ ہو اس کا بیان آنے والی نسلیں اس کمی کو پورا نہیں کر سکتیں جو وقائع نگاری میں معاصرین کے قلم سے رہ جائے بے شک آئندہ نسلوں کو ٹھنڈے دل سے بے لگاؤ فیصلہ کرنے کا موقع بمقابلہ معاصرین زیادہ ملتا ہے لیکن جن واقعات کو ہم عصر بیان نہ کریں ان کو وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں"

مولانا شبلی نے اگرچہ کسی ہم عصر کی سوانح حیات نہیں لکھی لیکن مشاہیر سلف کے سوانح اور تذکرے لکھے۔ رائل ہیروز آف اسلام کے سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے خلیفہ مامون رشید کو انتخاب کیا اور المامون کے نام سے اس کی لائف شائع کی خلیفہ مامون نہ صرف تدبر اور سیاست میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے بلکہ اس کا تفقّہ بھی مسلّمات سے ہے اور وہ سلسلہ راویان حدیث کی بھی ایک کڑی ہے۔ اس لائف میں جہاں اس کے فضائل و کمالات بیان کئے ہیں

وہاں اس کی رنگین زندگی کا بھی دل آویز نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے نعیش و مے نوشی اور نغمہ و سرود کے شوق کو بھی دلچسپ اور رنگین بیانی سے دکھایا ہے۔ مولانا نے اس کے بعد اور سوانح عمریاں بھی لکھیں لیکن ان میں ایسی زندگی کا مواد نہیں مل سکا۔ البتہ جب شعرالعجم لکھنے بیٹھے تو شیخ سعدی خواجہ حافظ حضرت امیر خسرو کے تذکروں میں ان کے تقدس و عظمت سے قطع نظر کر کے بہت کچھ لکھا مثلاً سعدی کے بیان میں (۱) حسن پرستی امرد پرستی تک پہونچ گئی ہے اور ایسے کھل کھیلتے ہیں کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا جا سکتا (۲) وقت کی تہذیب دیکھو شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش ایک امرد کو گلے لگا لیتا ہے پیار کرتا ہے، منہ چومتا ہے اور پھر بدیہہ دلیری سے کہتا ہے کہ "ایں بگفتیم و بوسہ چند بر سر و روئے یک دگر دادیم و وداع کردیم"

خواجہ حافظ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وہ فطرۃً شگفتہ طبع اور رنگین مزاج تھے اس لئے عشق و عاشقی سے ان کو وہیں تک تعلق ہے جہاں تک لطف طبع اور شگفتگی خاطر کے کام آئے وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کر دیں گلیوں میں پڑے پھریں۔ ان کا عشق بھی لطف نظر ہے۔ اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی، دل تازہ ہو گیا پاس بیٹھ گئے ہم زبانی کا لطف اٹھایا زیادہ چھیلے تو سینہ سے لگا لیا گلے میں باہیں ڈال دیں اس حالت میں بھی کوئی برا خیال نہیں پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے خود فرماتے ہیں ؎

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن
منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

حضرت امیر خسروؒ کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں کہ

"حسن نہایت صاحبِ جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر کا عین شباب تھا ایک دن اتفاق سے ان کی دکان کے سامنے سے گذرے۔ آفتابِ حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں وہیں ٹھہر گئے..... حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی لیکن خود بھی شکار ہو گئے۔ امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی ؎

زیں دلِ خود کام کارِ من بہ رسوائی کشید
خسروا فرمانِ دل بروں ہیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کردیا"

سوانح نگاری کے ان اصول اور مثالوں کو ملحوظ رکھنے کے بعد سوانح حیات کا مواد فراہم کرنا بھی بڑی کٹھن منزل ہے، اگر کسی ایسے مشہور آدمی کی سوانح عمری مرتب کی جائے جس کو دنیا چھوڑے ہوئے مدت گذر گئی تو ہم کو کتب خانوں کی امداد سے ممکن ہے کہ بہت کافی مواد مل جائے

اور اسی طرح مل بھی جاتا ہے اور اُنہی حوالوں پر حصر کرنا پڑتا ہے، جو بہت سی کتابوں کی ورق گردانی سے ملتے ہیں مگر پھر مرتب، یا مصنف کی تنقیدی صلاحیت پر سوانح حیات کا معیار قائم ہوتا ہے۔

اکثر تو فرط عقیدت سے اعتراض یا تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا تاویلات بارد سے اس پہلو کو تابناک ہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن ہم عصر یا قریبی زمانہ کے مشاہیر کی سوانح حیات کی ترتیب بڑا سخت ہفتخواں ہے، اول تو مواد بڑی سعی و جستجو سے حاصل ہوتا ہے پھر ضروری ہے کہ ذاتی تعلق ہو اور معلومات کامل حاصل ہوں۔ رسائل و اخبارات، جلسوں اور انجمنوں کی رودادیں اور مداحوں اور نکتہ چینوں کے بیانات وغیرہ سامنے ہوں۔ ان کے علاوہ وہ خطوط بھی نہایت اہم ہیں جو انہوں نے لکھے ہوں یا ان کے نام لکھے گئے ہوں، بعض ایسے خطوط بھی ہوتے ہیں کہ کاتب یا مکتوب الیہ دوسرے ہوتے ہیں مگر ان میں اسی شخص کے متعلق کچھ بیانات ہوتے ہیں تاہم "صرف ایک ہی شے انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے۔ چونکہ لکھنے والے کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظر عام پر آئیں گے پھر بہت سے مکتوب الیہ ایسے ہوتے ہیں جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہیں جن سے کوئی پردہ نہیں، اس لئے وہ نہایت سادہ اور بے تکلفی کے

ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش حوالہ قلم کرتا جاتا ہے اس لئے اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ درحقیقت ہے۔

انسان کی بڑی سی بڑی لائف اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا کا خاص اہتمام کیا جائے تاہم سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑ دینے پڑیں گے۔ بیچ بیچ میں ہفتوں، مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جاتے ہیں لیکن اکابر رجال اور خصوصاً اہل قلم اور مصنفین کے بہت کم دن ایسے گذرتے ہیں کہ ان کو خود خطوط لکھنا اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینا نہ پڑتا ہو۔ اس لئے اس مسالہ سے اگر ان کی سوانح نگاری کا فرض ادا کیا جائے تو ان کی زندگی کے روزنامچہ کا کوئی خانہ خالی نہ رہ سکے گا۔"

(مقدمہ مکاتیب شبلی از علامہ سید سلیمان)

حیات شبلی حیات جاوید کی اشاعت کے کم و بیش بیالیس سال بعد مولانا شبلی کے ارشد تلامذہ اور جانشین ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے خود مولانا شبلی کی سوانح عمری (حیات شبلی) شائع کی جس کا حصہ اول نو سو صفحات پر مشتمل ہے، حیات شبلی میں مرتب حیات نے مکاتیب شبلی سے اتنا استفادہ کیا ہے کہ اس کو خود نوشت قرار دیا ہے۔" اس نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حیات شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔"

یہ امر بھی ناقابل انکار ہے کہ حیات شبلی کی ترتیب کے وقت سوانح عمری لکھنے کے وہ اصول جو مولانا شبلی اور نواب شروانی نے بیان کئے ہیں علامہ

مرتب کے پیش نظر نہ تھے۔ تاہم جب تنقیدی نظر سے ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ علامہ مرتب نے متذکرہ اصول سوانح نگاری سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ بیشتر رطب و یابس روایات پر واقعات کے ہوائی قلعے بنائے اور دوسروں پر گولہ باری کی ہے واقعات کی تخلیق، ان کا اخفا، حق و باطل کی تلبیس، مبالغہ، تبختر رکاکت بیان، علی گڑھ تحریک اور سرسید کی تنقیص و حقارت اور افترائیات کا ایک طومار ہے اور طرہ یہ ہے کہ خطوط شبلی کو جو مکاتیب شبلی سے ایک علیحدہ مجموعہ ہے اور صرف دو بیگمات (عطیہ بیگم فیضی و زہرہ بیگم فیضی) کے نام ہیں۔ قطعی نظر انداز کر دیا حالانکہ ان سے مولانا کے ایسے اہم تعلقات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو دوسروں کے ساتھ حیات شبلی میں بیان بھی کئے گئے ہیں مثلاً زہرہ بیگم کو لکھتے ہیں کہ "ہاں آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا تھا۔ عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں حسن صاحب مرحوم عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے اسی لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہیئے، میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے اس لئے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں"۔ ۵۔ مارچ ۱۹۰۸ء

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "ندوہ کا جھگڑا نہ ہوتا تو میں بمبئی کو گھر بنا لیتا"۔

ایک خط اور دیکھئے "آپ نے تاریخ کی فرمائش کی ہے یہ امر محتاج اظہار نہیں کہ مجھ کو آپ کے کسی کام کے انجام دینے سے کس قدر خوشی ہو سکتی

ہے بلکہ مجھ کو تو آپ کا فیملی شاعر کہنا چاہیئے۔"

ایک تمنّا بھی ملاحظہ کیجئے "جزیرہ آنا سخت مشکل ہے، آپ کی طرح آزاد ہوتا تو سال بھر جزیرہ میں ہی رہتا۔" پھر ان خطوں میں مولانا کے بڑے خاص رجحانات و میلانات نمایاں ہیں، اہم اعترافات و اسرار ہیں علمی اصلاحی اور قومی مسائل ہیں اور وہ خیالات و نظریات ہیں جو کبھی مولانا نے پبلک میں یا تصنیف و تالیف میں ظاہر نہیں کئے۔ مثلاً وہ عورتوں کی تعلیم کے لئے کس قسم کا نصاب پسند کرتے تھے۔ عورتوں کے حسن و جمال کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے۔ موسیقی سے کتنی دل چسپی تھی اور اس میں کتنی مہارت تھی۔ حجاب کی نسبت عقیدہ و عمل کیا تھا اور دونوں میں کتنا تضاد تھا۔ اپنے فارسی تغزل پر خود کیا رائے رکھتے تھے۔ عوام کی مرضی کا کس قدر لحاظ تھا اور وہ ان کے اصلی خیالات و رجحانات پر کس درجہ موثر تھا۔ ان خطوط کی نسبت مولوی ڈاکٹر عبد الحق اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ :-

"مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے گھُن لگنی شروع ہوگئی ہے زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتب خانوں میں نظر آئیں گی لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انہیں میں یہ خطوط ہیں جو بمنزلہ اِس اِبہار کے ہیں اِس لئے بہ تکلف سے اونچا و صحیح

بری ہیں۔ یہ دلی جذبات وخیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ بے ریائی اور خلوص کی سچّی تصویریں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤ پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور پڑھنے والوں کے دل لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔"

شیخ محمد اکرام صاحب (جوائینٹ سکرٹری اطلاعات ونشریات پاکستان) جو ایک قابل ادیب ہیں اپنی کتاب شبلی نامہ میں لکھتے ہیں کہ

"خطوط شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے بظاہر تو یہ چند صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں ہی محبت کا ایک مکمل ڈرامہ آگیا ہے اور اس انداز سے کہ اس میں آورد اور تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ندی ہے جو پہاڑی چشموں سے پھوٹتی ہے پہلے گلزاروں اور مرغزاروں کی سیر کرتی ہے پھیلتی ہے اور تیز تر اور تُند تر ہوتی جاتی ہے پھر یک لخت تغافل اور عتاب کے صحرا میں جاکر آنکھوں سے نہاں ہو جاتی ہے۔ خطوط شبلی میں محبت کی چہلیں ہیں حسن وعشق کے راز و نیاز ہیں اور اخیر اخیر میں حُسن کا جلالی رنگ جھلکتا ہے۔"

ان کے علاوہ مکاتیب حصہ اوّل میں ہی متعدد خطوط اور بھی ہیں جو بعض تو خطوط شبلی کی شرح ہیں اور بعض سے حیات شبلی کی دوسری قسم کی رنگینی

اور مختص میلانات کا اظہار ہوتا ہے مگر شبلی کے روزنامچۂ زندگی کے یہ خانے خالی چھوڑ دئیے گئے، حالانکہ اسی کتاب میں سرسید پر حملوں کے مواقع پیدا کرنے کے لئے جو کاوش کی گئی ہے وہ دیکھئے :-

"اب جیسے جیسے دن گذر رہا ہے سرسید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط اور پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے اور اب وہ موقع آرہا ہے کہ سرسید کے حلقہ سے باہر آجانا پڑے۔ اس اختلاف حال اور کشمکش کے اسباب گو حیات جاوید میں جگہ نہ پا سکے مگر تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے، ضرورت ہے کہ جہاں تک حیات شبلی کا تعلق ہے ان اسباب پر ایک نظر ڈال لی جائے اور گو مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردہ سے اب بھی روشنی چھن چھن کر نکل رہی ہے۔ اگر ہم ان شعاعوں کو یکجا کریں تو ان اسباب پر دن کی روشنی پڑنے لگے گی"

لیکن علامہ مرتب کو اپنے استاد اور صاحب سوانح کے متعلق ماہ مئی کے نصف النہار کی روشنی بھی نظر نہ آئی۔ یہی نہیں بلکہ جب شبلی کے ہی ایک مخلص رفیق (مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی نے اپنی کتاب "یاد ایام" میں کچھ روشنی دکھانی چاہی تو ان کو لکھتے ہیں کہ

یاد ایام کی اصل کاپیاں واپس مرسل ہیں۔ میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں غایت بے تکلفی

سے بعض ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی آغاز شباب کے لئے ہوتے ہیں۔ در جوانی افتد چناں کہ تو دانی، مگر جب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے گناہ کا ستر چاہیئے نہ کہ تشہیر۔ اس لئے ازراہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطہ سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تاکہ ان کا نام نیک ضائع نہ ہو۔ یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں۔ آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدر دانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی بالکل غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء[۵۱] سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۶ء سے ہے[۵۲]"

غرض یہ کتاب "حیات شبلی" اپنی خصوصیات میں منفرد ہے اور شاید منفرد ہی رہے گی۔

۵۱: حیات شبلی میں خود ہی یہ آغاز ۱۹۰۶ء سے بیان کیا ہے۔

۵۲ سید سلیمان ندوی ۱۰ مارچ ۱۹۴۶ء

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی
کے
مختصر حالات زندگی

مولانا شبلی مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ بندول اور علمی و شریف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی عمر کو پہونچے تو قدیم طرز کے مطابق تعلیم کا آغاز ہوا، پھر اعظم گڈھ اور جونپور کے عربی مدرسوں میں تعلیم پائی۔ مولانا فاروق چڑیا کوٹی سے معقولات کا درس لیا اور انہی کی تربیت سے فارسی ادب کا مذاق پیدا ہوا۔ زاں بعد مولانا ارشاد حسین (رام پور) کے حلقہ درس میں تقریباً ایک سال فقہ و اصول کا درس لیا۔ ایک مہینہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہے۔ کچھ دنوں مولانا فیض الحسن سے عربی ادب پڑھا اس کے بعد سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث کے حلقہ درس حدیث میں شامل ہوئے۔ ہنوز سنن ترمذی تک نوبت پہونچی تھی کہ بعض اہل خاندان کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ سال تھی۔ متفرق مقامات میں قدیم اعلیٰ تعلیم کا زمانہ بہت کم رہا۔ اسی وجہ سے کسی شعبہ علم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ ۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۶ء تیرہ سال کی تمام مدت

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی

تعلیم میں صرف ڈہائی سال ادب وفقہ اورحدیث کی تعلیم کے ہیں۔

حج سے واپس آکر اردو میں دکالت کا امتحان دیا کامیاب ہوئے چند ماہ کام کیا مگر ناکام رہے تو تحصیل میں ملازمت کی اور امین مقرر ہوئے۔ یہ خدمت بھی موزوں حال نہ ہوئی تو مستعفی ہوکر معلمی کا مشغلہ اختیار کیا۔ علمی مشاغل میں اردو، فارسی شعروسخن اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا موضوع غیر مقلدی کی تردید ومناظرہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اپنے والد کے ہمراہ علی گڑھ گئے اظہار قابلیت کے لئے ایک عربی قصیدہ بھی لکھ کر لے گئے۔ چند ماہ بعد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے عربی فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ چالیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا، کالج سے فاصلہ پر شہر میں کرایہ کا مکان لے کر قیام کیا۔ اس وقت مولانا شبلی کی عمر ۲۵/۲۶ سال تھی۔ محلہ سکونت کا ماحول اخلاقی لحاظ سے ایک نوجوان کے لئے اچھا نہ تھا پھر ایک مرتبہ تھئیٹر میں بھی پائے گئے۔ سرسید "خود در جوانی افتد چناں کہ تو دانی" کا ذاتی تجربہ تھا۔ وہ تو ایک ہی جھٹکے میں اس افتاد سے نکل گئے تھے مگر ہر جوان آدمی سے یہ امید کیونکر ہوسکتی تھی، اس لئے سرسید نے شبلی کو ایسی کسی افتاد سے بچانے کے لئے اپنے بنگلہ کے احاطہ میں ایک چھوٹی سی بنگلیا میں منتقل کرلیا اور اپنے قریب رکھ کر مولانا کی صلاحیتوں کو ترقی دینے اور نمایاں کرنے پر توجہ مائل کی۔

ملازمت شروع ہونے کے بعد ہی انہوں نے پہلی نظم بطور مرثیہ سالار جنگ اول کی رحلت پر لکھی (مولانا حالی اس سے پہلے لکھ چکے تھے اور

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہو چکی تھی) دوسری اردو نظم ۱۸۸۴ء میں "صبح اُمید" ہے۔ اس میں مسلمانوں کے تنزل و ادبار کا افسانہ اور علی گڈھ تحریک کا خوش آیند مرقع ہے۔ اور چند اشعار سرسید کی تعریف میں بھی ہیں[۵۱] (اس زمانہ میں مسدس حالی کی شہرت پھیلی ہوئی تھی جو ۱۸۷۹ء میں لکھا گیا تھا)

نثر کی ابتدا مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے ایک مقالہ سے ہوئی جو ۱۸۸۷ء کے اجلاس کانفرنس میں پیش ہوا۔ اس کے بعد المامون تالیف کی جو مستقل سلسلۂ تصانیف کی پہلی کڑی ہے۔

سرسید نے مشاہیر کی لائف کا ایک سلسلہ "ال" کے نام سے شروع کرنا چاہا تھا اور اس کی ابتدا اسی "المامون" سے ہوئی۔ پہلی اشاعت پر کچھ تنقیدات ہوئیں، دوسری اشاعت ان تنقیدات کو ملحوظ رکھ کر کی گئی۔ سرسید نے اس پر مقدمہ لکھا ابھی تک تقریظیں آخر کتاب میں ہوا کرتی تھیں اغلباً اسی مقدمہ سے مقدمات کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد سیرۃ النعمان ترتیب دی۔ ۱۸۹۲ء میں علمی مقصد سے استنبول اور مصر و شام کا سفر کیا۔ استنبول میں دارالمتعلمین علی گڑھ کے معلم اول کی حیثیت سے ان کو درجہ چہارم کا تمغہ مجیدی ملا۔ واپس آکر سفرنامہ لکھا۔ غرض ان تصانیف اور

۵۱:۔ سید سلیمان حیات شبلی میں لکھتے ہیں " مولانا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے (مولانا نے تو خارج کیا مگر دارالمصنفین نے شامل ہی رکھا)

ان نظموں سے جو بعض مقتدر مہمانوں کی آمد کے موقع پر پیش کرتے تھے نیز ان مقالات و مضامین کو جو کالج میگزین شائع ہوتے تھے۔ شبلی نے ایک علمی حیثیت حاصل کر لی، سرسید ہر موقع پر ان کی مربیانہ حوصلہ افزائی کرتے مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد جو شبلی سے عمر میں بڑے اور ملک کے علمی طبقوں میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور علمی معیار سے بھی بلند تھے۔ شبلی کو نمایاں کرنے اور آگے بڑھانے میں توجہ رکھتے۔

صوبہ متحدہ میں اگرچہ متعدد کالج تھے لیکن ایم اے او کالج علی گڑھ اور ایم۔ بی کالج الہ آباد سب میں ممتاز تھے۔ خصوصاً علی گڑھ تو بعض اعتبارات سے تمام ملک کے کالجوں میں امتیاز رکھتا تھا شبلی کو جو تمغہ مجیدی ملا تھا وہ بین الاقوامی قانون کی رو سے استعمال نہیں کر سکتے تھے اور اس کا افسوس بھی تھا صوبہ کے حکمران وقت سر آکلنڈ کالون کے سرسید سے دیرینہ اور خاص مراسم تھے اور وہ بہت جلد سبکدوش ہو رہے تھے۔ سرسید نے ان سے شبلی کو شمس العلما کا خطاب دئے جانے کی سفارش کی۔ ایم۔ بی کالج کے پروفیسر مولوی ذکاء اللہ خاں کو یہ خطاب مل چکا تھا۔ سر آکلنڈ کالون نے کوشش کی اور نوروز ۱۸۹۴ء کی تقریب پر مولوی شبلی نعمانی شمس العلما بھی ہو گئے خطاب کی پہلی خبر ملتے ہی شمس العلما سرسید کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ جانتے تھے کہ لفظی شکریہ سے وہ خوش نہ ہوں گے۔ پچاس روپیہ کالج فنڈ میں نذر کے لئے بھی لے گئے جنوری ۱۸۹۴ء میں کالج میں ایک نہایت شاندار تہنیتی جلسہ ہوا۔ سرسید محسن الملک سید محمود اور دیگر اعیان کالج

شریک تھے تقریریں ہوئیں نظمیں پڑھی گئیں۔ آخر میں شمس العلما نے تقریر کی[۱] جس میں اپنی نسبت کالج کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے اخیر میں کہا کہ

"حضرات یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز اس کا نشو و نما، اس کی ترقی، اس کی نمود اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اسی کالج سے ہوا ہے۔۔۔۔۔ غرض جو کچھ میں نے سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں۔ اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں"

پھر سید محمود محسن الملک مولانا حالی کی تعریف اور ان کی کالج میں موجودگی کے اثرات بیان کر کے کہا کہ:۔

"حضرات میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے اس میں اسی بڑے شخص کا جلوہ موجود ہے ؎

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے[۲]

---

[۱]:۔ مرتب حیات شبلی نے اس جلسہ کی روداد ۳۵ صفحات میں لکھی ہے مولانا شبلی کی بھی تقریر ہے۔ مگر یہ حصہ چھوڑ دیا۔

[۲]:۔ صدر یار جنگ شروانی نے مولانا شبلی کے انتقال پر جو مضمون لکھا تھا (باقی صفحہ ۱۴ پر)

۱۸۹۵ء میں کالج میں ایک بڑا غبن ہوگیا جس سے مالی حالت متزلزل ہوگئی اور آئندہ ترقی کی امید نہ رہی۔ اسی سال مولانا کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا اور بھی افکار رہتے۔ آخر سال میں وزیر اعظم حیدر آباد دکن کالج میں آئے شمس العلماء سید علی بلگرامی بھی ہمراہ تھے۔ اب مولانا کا خیال حیدر آباد سے وظیفہ علمی مقرر ہونے کی کوشش کی طرف رجوع ہوا۔ چنانچہ اس خیال نے یہ عملی شکل اختیار کی کہ ایک درخواست وظیفہ دی جس میں یہ خواہش تھی کہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰) اس میں ان کے علی گڑھ آنے اور سرسید کی خدمت میں پیش ہونے اور ان کی علمی زندگی کے راستہ کا بھی بیان ہے مگر مرتب حیات شبلی نے اس ذکر کے نقل میں اس راستہ کو چھوڑ دیا۔ "یہ راستہ تھا مولانا شبلی کے علامہ شبلی بننے کا پھر سرسید کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلے کر آرہے۔ سرسید مرحوم کو خداوند تعالےٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا۔ ذوق علم ان کے رگ و پے میں ساری تھا ان کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح قدح ہوتی تھی۔ جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔" یہی صدر یار جنگ موثق حیات ایک دوسری تقریر یاد سرسید میں شبلی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

"سرسید کی صحبت خود ایک درس گاہ تھی جس کے اثر نے بڑے بڑے ادبی و علمی انقلاب دنیا میں پیدا کئے یہ اسی حیات آفریں صحبت کا اثر تھا کہ مولانا شبلی مرحوم نے مورخ بن کر بے بہا علمی خدمات انجام دیں۔" مگر مرتب حیات کو یہ صفحہ سادہ ہی نظر آیا۔

معمولی درس سے یک سو ہو کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہیں۔ چنانچہ سید علی بلگرامی کی کوشش سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا[۵۱]۔ مگر مولانا سرسید کی زندگی میں کالج سے انقطاع تعلق مناسب نہ سمجھا اور چونکہ حکم وظیفہ بھی مشروط تھا اس لئے وہ جاری بھی نہ ہوا۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہوا تو مولانا شبلی اس درجہ متاثر ہوئے کہ ایک دوست کو اس واقعہ کے اطلاعی خط میں لکھا کہ[۵۲]

"نمی دانم حدیث نامہ چوں است
ہمی دانم کہ عنوانش بخوں است

ملت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ یوم یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کوئی شغل اختیار کرنے پر قدرت نہیں رکھتا مگر

۵۱:۔ ۱۸۸۸ء میں جب کہ مولانا حالی اینگلو عربک کالج لاہور میں ملازم تھے۔ نواب سر آسمان جاہ وزیر اعظم دکن علی گڑھ آئے تھے۔ مولانا بھی ٹرسٹی کی حیثیت سے موجود تھے۔ پرائیوٹ گفتگو میں مولانا سے مشاغل کا حال معلوم کیا اور طے ہوا کہ جو مشاہرہ ملتا ہے اسی قدر حیدر آباد سے وظیفہ ہو جائے اور تصنیف و تالیف میں بہ اطمینان مصروف رہیں۔ چنانچہ مولانا ملازمت سے مستعفی ہو گئے یہی نظر شبلی کے سامنے بھی تھی۔

۵۲:۔ خط عربی میں ہے۔ حیات شبلی میں درج ہے اور اس اثر کا اندازہ ہوتا ہے جو شبلی کے دل و دماغ پر تھا۔

کچھ زمانہ گذرنے کے بعد؎۱

سرسید کے انتقال کے بعد مولانا شبلی نے طویل رخصت لی، اور پھر مستعفی ہو گئے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں بیمار رہے اور درستی صحت کے لئے کشمیر گئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں دوسری مرتبہ تاہل کیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد میں سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر تقرر ہوا۔ یہاں تصنیف و تالیف وغیرہ میں مصروفیت رہی لیکن چار سال بعد سررشتہ کے مصارف و کارکردگی کے متعلق ایک کمیشن قائم ہوا، تو بددل ہو کر مستعفی ہو گئے اور لکھنؤ پہونچکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں چند علما کی مساعی سے ندوہ قائم ہوا۔ سرسید اور دیگر

؎۱ :- مرتب حیات شبلی اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائیگی کہ جس کی مدح انہوں نے کئی دفعہ لکھی اسکے مرثیہ میں ایک شعر بھی انہوں نے نہیں کہا مگر واقعات کی روئداد آپ کے سامنے ہے اسکو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور جھوٹی شاعری اس کی افتاد طبیعت نہ تھی"۔ (۳۳۱) لیکن مولانا نے تو بجز ایک نظم مدح کے جو امیدواری کے زمانہ میں لکھی تھی کوئی اور نظم مدح نہیں لکھی۔ البتہ بعض قومی نظموں میں کچھ شعر ضمناً آجاتے ہیں۔ مرثیہ نہ لکھنا تبدیلی قلب کی علامت نہیں خود مصنف نے اسی کتاب میں بیان کیا ہے کہ جب مولانا سے ان (مہدی) کے (زیادہ) مرثیہ نہ لکھنے کی وجہ پوچھی گئی تو بولے حواس کب بجا تھے"۔ اس عربی خط میں تو حواس منتشر ہونے کا صاف اشارہ ہے۔ پھر مولانا نے متعدد اصحاب کے مرثیہ قصائد لکھے مگر مرثیے نہ لکھے وقار الامراء ان کے بڑے محسن تھے ان کی اچانک موت پر ایک شعر بھی نہ کہا۔

اعیانِ کالج نے پرجوش خیر مقدم کیا۔ یعنی کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۴ء میں محسن الملک اور سید محمود نے تائید میں زبردست تقریر کی۔

اجلاس ندوہ میں کالج سے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات اور مولانا شبلی شریک ہوئے۔ مولانا نے اڈیٹر کی حیثیت سے کالج میگزین میں روداد شائع کی۔ پھر ۱۹۰۵ء تک جب موقع ملتا، اجلاسوں میں شریک ہوتے ایک دارالعلوم کے قیام اور تعلیم قدیم وجدید کے انضمام سے خاص دلچسپی تھی اب دارالعلوم کو نئے قالب میں ڈھالنے کا موقع ملا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی ندوہ کی ترقی میں بھی کوشاں رہے۔ حکومت سے تعلقات خوشگوار بنائے۔ عمارت کے لئے زمین اور دینوی تعلیم کی امداد کے لئے گرانٹ حاصل کی ۱۹۰۸ء میں لفٹنٹ گورنر سے بڑی شاندار تقریب میں دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھوایا۔

۱۹۰۵ء میں دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ ۱۹۰۶ء میں بمبئی گئے ندوہ کی مالی امداد اور تفریح مقصود تھی۔ ۱۹۰۷ء میں بندوق سے پاؤں زخمی ہوا اور پنڈلی کلٹے تک نوبت پہونچی۔ مصنوعی پاؤں کیلئے پھر ۱۹۰۸ء میں سفر بمبئی کیا۔ اس تمام عرصہ میں ندوہ نے ہر اعتبار سے بڑی ترقی کی۔

۱۹۰۸ء میں مولانا نے وقف علے الاولاد کی تحریک اٹھائی اور ہر نقطۂ خیال کے علماء کو ہمنوا بنایا۔ سیاسی جماعتوں کی بھی تائید حاصل کی اور بالآخر ۱۹۱۳ء میں اس نے اسمبلی اور قانون سازی کے کل مراحل طے کرکے قانون کی شکل اختیار کی۔ اس کے علاوہ اور بھی مذہبی و قومی تحریکات میں حصہ لیا۔ تعلیمی کانفرنس کے

اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے۔ متعدد لکچر دیئے اور تقریریں کیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج بھی جاتے آتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شریک رہے۔ فراہمی سرمایہ کے سلسلہ میں دورے بھی کئے۔ مولانا شبلی کی زندگی کا یہ زمانہ ان کی انتہائی شہرت و عزت اور مقبولیت کا تھا مگر ساتھ ہی ندوہ کی جماعتِ انتظامیہ سے اختلافات پیدا ہو گئے جنہوں نے شدید کشمکش پیدا کر دی اور انجام کار مولانا کو معتمدی دارالعلوم سے مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی زندگی کا یہ نہایت المناک اور افسوسناک مرحلہ تھا۔ ان کے خلاف الزامات عائد کئے گئے، طلباء کو ان سے درس لینے کی ممانعت کی گئی اور میلاد نبوی میں خوان کو تقریر کرنے سے ممنوع کیا گیا۔ طلباء نے ان کی حمایت میں اسٹرائک کی اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ تائید کی۔ بلکہ سینئر طلباء کو پروپاگنڈا کی فنکارانہ تعلیم دی اور اسٹرائک کو مذہبی جواز کا رنگ دیدیا۔ پرائیوٹ خطوط میں اخلاق و ادب سے گذر کر ان علما و فقہا اور محدثین کو جن کا ندوہ سے انتظامی و تعلیمی تعلق تھا۔ منافقین نے سگان بازاری اشرار پاجی، خبیث تک لکھا[۵۱]۔ مولانا کی زندگی کا یہ رُخ جو ۱۹۱۲ء سے نمایاں ہوا۔ واقعات اور ان ہی کے خطوط و مکاتیب کی روشنی میں نہایت بھدا اور بدنما نظر آتا ہے۔ بعض اعیان علی گڑھ اور بعض ارکان لیگ نے ان کے مخالفین کی تائید کی تھی اور اس اسٹرائک کے متعلق مخالفانہ رائوں کا اظہار کیا تھا۔ اب مولانا نے ایک طرف علی گڑھ کے خلاف اور دوسری طرف لیگ کے

۵۱:۔ جامع مکاتیب علامہ سید سلیمان نے ایسے مکاتیب بھی شائع کر دئیے ہیں کہ جو مولانا کے اخلاق پر موثر ہیں۔

خلاف پرزور نظمیں لکھیں۔

اسی زمانہ میں انہوں نے سیاست پر بھی ایک مضمون کئی نمبروں میں لکھا۔ سرسید کی پالیسی اور مسلم لیگ کی موجودہ پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی۔ مگر یہ ساری سیاست متذکرہ مضمون اور چند نظموں تک رہی۔ ان نظموں میں طنز کے تیر و نشتر بھی تھے۔ ہنگامہ کانپور و واقعات بلقان پر بھی کچھ نظمیں لکھی تھیں، مگر حکومت کے چشم عتاب کی تاب نہ لاکر نہایت عاجزانہ معذرت میں پناہ لی۔

۱۹۰۶ء میں مولانا نے ایک مستند سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کئے جانے کی اہمیت و ضرورت پر الندوہ میں جمہور مسلمانان کو توجہ دلائی۔ ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم بردا اللہ مضجعہا نے تمام مصارف کی کفالت کی اور کام شروع ہو گیا۔

لہ اگرچہ میں نے حیات شبلی پر ایک مکمل تبصرہ ۲۴۶ صفحات کا شائع کیا ہے اور اس میں مرتب حیات کی نسبت جو اعتراضات کئے ہیں بغیر کسی منطقی بحث و دلیل کے حوالوں سے ثابت کیا لیکن اس موقع پر دو نمونے پیش کرنا ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۱۹۱۲ء کے جلسہ ندوہ کی تین تقریروں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی اور دل ہی کی گہرائیوں میں پیوست ہوئی جاتی تھی۔ اس انقلاب کا راز ان دنوں سیرۃ نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو (باقی صفحہ ۴۷ پر)

۱۹۱۳ء میں بمقام اعظم گڑھ دارالمصنفین قائم کیا۔ اپنا بنگلہ باغ کا حصہ اور کتب خانہ اس کے لئے وقف کیا۔ سیرت النبی صلعم کے لئے کچھ یادداشتیں بھی مرتب کیں بعض عنوانات بھی تحریر کئے متعدد جلدوں کا خاکہ مضمون بھی بنایا۔ چند روزہ علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا اور احاطہ دارالمصنفین میں مدفون کئے گئے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶) ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے۔" (ص ۵۰) حالانکہ مولوی شبلی کو علی گڑھ سے جدا ہوئے ۱۴ سال ہو چکے تھے، اور محبت کا یہ شعلہ بھی علی گڑھ سے ہی لے کر آئے تھے۔ سرسید کی خطبات احمدیہ فی تیز المحمدیہ اور اس کا مرحلہ تالیف ان کے پیش نظر تھا پھر اسی علی گڑھ میں مرتب حیات نے طلبا میں قرآن پاک کے درس و ذوق ذات نبوی سے طلباء کی عقیدت مجالس میلاد کے قیام فن سیرت میں عربی میں رسالہ بدء الاسلام کی تصنیف اور اس کا داخل نصاب ہونا طلبا میں مذہبی رنگ کو دو صفحات ۱۴۹-۱۵۰ میں بیان کیا ہے۔ ندوہ میں تو صرف تین تقریریں تھیں علی گڑھ میں فیض جاریہ تھا۔ رسالہ کا فارسی میں اور پھر اردو میں ترجمہ ہوا اور مختلف کلاسوں میں داخل نصاب کیا گیا۔ ایک ملازم اور ایک آقا فرماں روا کی گفتگو دیکھئے۔ منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے لٹریری سیکرٹری تھے۔ سرکار سے عرض کیا کہ حضور آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے۔ آپ اس کو بڑھ کر کیوں نہیں اٹھا لیتیں یعنی ایک عاشق رسول مصنف کے گلے میں جھولی ڈال کر سیرت نبوی کی تصنیف کے لئے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے۔ یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔ یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

مرتب حیات شبلی نے آخر میں اپنے اور بعض اصحاب کے چند نوحے مرثیے اور قطعے تو شائع کئے لیکن ان تاثرات کا پتہ نہیں جو قومی مجالس و ادارات اور اخبارات اور تعزیتی خطوط میں ہوتے ہیں۔

مولانا شبلی کی فطرت عشقی مولانا شبلی کے مختصر و سادہ واقعات زندگی پڑھنے کے بعد پہلے یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ان کی فطرت سراسر جذباتی تھی جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما رہی۔ قدرت کی فیاضی نے عشق و محبت کا خمیر اس فطرت میں اعتدال سے زیادہ رکھا تھا حسن ان کو جلد مسحور کر لیتا تھا اور وہ اِنِّیْ اُحِبُّ الْحُسْنَ حَیْثُ وَجَدْتُہٗ کے مصداق اتم تھے۔ ان کے لئے بتقاضائے فطرت میلوں ٹھیلوں کی تماشے تھیٹروں کی سیر رنگیں صحبتوں کی شرکت دل رُبا صورتوں کا نظارہ ناگزیر تھا۔ اور باوجود اپنے علم و فضل اور عالمانہ و فاضلانہ حیثیت کے فطرت کے تقاضہ کو مغلوب نہیں کر سکتے تھے۔ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت علمی کو گئے تو قاہرہ میں تھیٹر دیکھے بغیر نہ رہ سکے اور پھر اپنے سفرنامہ میں بھی اس کا بیان کیا اور نظم میں بھی ؎

گاہ در قاہرہ پنہاں بتقاضائے ہوس
بہ تھیٹر شدہ و در جلوہ گہ ناز آمد

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۷) انہوں نے اس حصول سعادت کی رضامندی ظاہر کی منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان سے باقاعدہ درخواست منگوائی (۷۰۵) اس ادبی شان کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر یہ شعر آجاتا ہے کہ ؎

بوریا باف گرچہ بافندہ است ٭ نبرندش بکارگاہ حریر

ساتھ ہی شاعر تھے اور فارسی شاعری میں بلند درجہ رکھتے تھے، تغزل حقیقت نہیں ہوتا مگر بعض اوقات حقیقت تغزل بن جاتی ہے۔ شبلی نے اپنی شاعری کے متعلق خود لکھا ہے کہ "میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر لکھنے کے بالکل قادر نہیں یعنی بغیر خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا" اس لئے ان کی ہر نظم اور خصوصاً غزل کو کسی نہ کسی تاثر کا نتیجہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

شبلی کے واقعاتِ زندگی اور مکاتیب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ قدرت کی نوع بنوع فیاضیوں سے تمتع کے ساتھ وَلِلحُسنِ فِی وَجْہِ المِلَاحِ مَوَاقِع سے محروم تھے۔ اور اس محرومی کی وجہ سے وہ ایک روحانی بےچینی میں مبتلا تھے اور بعض مواقع پر ایسی کیفیتیں ان پر طاری ہو جاتی تھیں جس میں ان کی حیثیت و شخصیت گم ہو جاتی تھی۔

بقول مرتب حیاتِ شبلی "عشق و محبت کا جذبہ فطرتِ انسانی کا خمیر ہے اور ہمارا فلسفہ اخلاق تو عشق نفسانی کو بھی ایک فضیلت قرار دیتا ہے۔

"عشق نفسانی کہ مبدا آں تناسبِ روحانی است در عدادِ رذائل نیست بلکہ از فنونِ فضائل است۔"

اس لئے اگر مولینا شبلی کے عشق و محبت کے افسانوں کو بیان کیا جائے تو ان کی علمی و قومی عظمت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ شبلی نے بھی تو سعدی و حافظ اور حضرت امیر خسرو کے افسانے لکھے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ بغیر ان افسانوں کو بیان کئے ہوئے حیات شبلی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھکر دیکھئے کہ یہ مختصر تبصرہ نہ تو شبلی کی تفضیح و تضحیک سے اور نہ بلحاظ [illegible] یہ [illegible] تکملہ حیاتِ شبلی ہے۔

بمبئی کے سفر

شبلی بیا کہ گرمیٔ بازار بمبئی امسال نیز ہست بہ رنگے کہ پار بود

۱۹۰۶ء میں مولانا بمبئی گئے تھے مرتب حیات شبلی اس سفر کی نسبت لکھتے ہیں کہ :-

"مولانا گرمی اور لُو تو برداشت کر لیتے تھے مگر برسات کا حبس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے اس زمانہ میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا ان کو پسند تھی۔" (۴۵۱)

لیکن قبل ازیں یہ موسم انہوں نے کبھی بمبئی میں بسر نہیں کیا۔ سلسلہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تو صرف غم غلط کرنا مقصود تھا کیونکہ چند ماہ قبل محبوب بیوی کا شادی کے پانچ سال بعد انتقال ہو چکا تھا اور بقول مرتب حیات" دوسری بیوی سے بھی محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا انتقال ہوا تو فرمانے لگے کہ میں اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا۔" (۷۷۸)

غرض اسی مقصد سے قرآن پاک ختم کا درس مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

مدرس اول دارالعلوم کے سپرد کر کے بمبئی کا سفر کیا"۔ (۱۵۴) چنانچہ بمبئی میں جلوہ گاہ حسن (چوپاٹی واپالو) کے روزانہ سیر و تماشہ اور نظارہ سے غم غلط ہو گیا اور صدمہ کی جگہ دل و دماغ میں ایک پُر کیف جوش پیدا ہو گیا۔ مصنف حیات شبلی لکھتے ہیں:۔

"میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا، اور یہی دستہ گل کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا۔ دستہ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں" نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ دلورا" مولانا کو انیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا۔ ۱۱ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

" ۱۹۔برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا اپالو یہاں عجیب سیرگاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرع کو بدل دیا ہے۔ ع

کنار آب چوپاٹی و گل گشتِ اپالو را

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

بہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا

گذشتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را

(مہدی ۲۲) ۱۱ستمبر ۱۹۰۶ء بمبئی

ان غزلوں کی نسبت مصنف سوانح نے

غزلوں کی مستی و حقیقت لکھا ہے کہ:۔

(۱) یہ غزلیں اتنی سست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشمِ ساقی کی مستی بھی آمیز ہے خود شاعر نے بھی اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے۔

اندکے نیز بکام دلِ خود بیں باشم
روزگارے چو دم از دانشِ عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کردہ سخن فاش بگو
سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست بنود
شیشۂ تقوۂ سی سالہ بسنداں زدہ ام
آں شد اے دوست کہ آراستے پیکرِ فن
نقشِ زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام
آں شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبتِ آں دشمنِ ایماں زدہ ام

(۲) وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ اس "دشمنِ ایمان" کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے۔

(۳) یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان اور طرزِ ادا کی بڑی بڑی تعریفیں ہوئیں معاصر شعرا نے جوابی غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز و اسرار سمجھے اور مولانا سے دست بیعت ہوئے

اوران کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں جو بدگمان تھے وہ وصف عنوانی کی تلاش میں لگ گئے حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ بلکہ صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسن منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا۔ خطوط شبلی کے اوراق میں یہ سامان نہیں ان کی تاریخ دو برس بعد سنہ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے (۵۱م۔ حیات شبلی)

اب ذرا غور فرمائیے حیات شبلی کی ترتیب کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ "علی گڑھ" کا لفظ مرتب حیات کے لئے کابوس بن گیا تھا دیکھئے کہ آخر شعر میں کس طرح بدمذاقی کے ساتھ علی گڑھ تحریک سے علیحدگی اور ندوہ میں شمولیت کی تاویل کی ہے حالانکہ مولانا تو سنہ ۱۸۹۴ء میں ہی ندوہ اور علی گڑھ تحریک دونوں سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد کی ملازمت میں بھی یہ ہی خواب دیکھتے رہے کہ موجودہ تعلقات سے آزادی مل سکتی تو پھر کالج میں رہ کر سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بغیر کسی معاوضہ کے صرف کریں [1] پھر خط موسومہ مہدی [۱۲] مورخہ ۱۲ مئی سنہ ۱۹۰۲ء میں لکھتے ہیں کہ "سامان ایسے نظر آتے ہیں کہ علی گڑھ کے دام میں دوبارہ گرفتار ہوں اگرچہ یہ وہ دام ہے کہ،

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

پھر ندوہ کی معتمدی کے زمانہ میں ہی ہم مولانا کو تعلیمی کانفرنس کے

---

[1] خط مورخہ ۱۱ اپریل سنہ ۹ء مشتہرہ اخبارات

پلیٹ فارم پر دیکھتے ہیں اور مسلم یونیورسٹی تحریک میں تو نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔ نہ صرف اس کی کمیٹیوں کی رکنیت میں بلکہ فراہمی سرمایہ کی جدوجہد میں بھی حصہ لیتے ہیں اور ایک نظم میں یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ؎

کنوں ہبنی کہ روزِ آں گلشن رنگیں بپا گردد
کہ شبلی ہم درو یک بلبل رنگیں نوا باشد

مولانا کا یہ مختصر دیوان جو بمبئی کی فضا اور سرجوشی کا اثر تھا ۱۹۰۸ء کے اوائل ہی میں طبع ہوا۔ ہر غزل پر تاریخ و سنہ اور مقام درج ہے۔ مولانا حالی نے اس کو پڑھ کر شبلی کو لکھا کہ "کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے۔

غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بے باکی پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔

؎ دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا ؎ الذی ابتلیٰ بمثل ما ابتلے بہ لقائی لہ

آزاد نے بھی لکھا ہے کہ غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے اور حقائق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سیکڑوں دفعہ دوہرا چکا ہوں لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں سے ابھر آتا ہے سے دو دل بودن الخ میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے کیونکہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے جب تک وہ طاری نہ ہو اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی"۔ (کاروان خیال)

غور کیجیے کہ مولانا حالی نے تو صاف کہہ دیا کہ اس نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہے اور ایک ابتلا بھی ہے۔ آزاد نے ایک خاص حالت کی طرف اشارہ کیا۔ ان دونوں کی سخن فہمی تو حرفی نہ تھی۔ مولانا نے اپنی غزلوں کے سلسلہ میں موثق حیات شروانی کو لکھا تھا کہ "غزلیں چھپنے کو دیتا ہوں ایک غزل کا شعر مجھ کو مختلف وجوہ سے بہت پسند آیا۔ آپ کو لکھتا ہوں واقعیت اور اظہار پر نظر فرمائیے سے بے حاصلی نگر کہ به این دوری از خش ؛ صد جائے بہر بوسہ نشاں کردہ ایم ما

مشہور ادیب و شاعر میر نیرنگ (انبالہ) دستہ گل اور خطوط کا رابطہ یوں قائم کرتے ہیں کہ

میری رائے میں یہ خطوط (بنام عطیہ) دستہ گل کے شان نزول و تفسیر کا درجہ رکھتے ہیں ورنہ اتنی بات تو دستہ گل کے شائع ہوتے ہی سب کی سمجھ میں آگئی تھی کہ "کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو" نے ایک بادہ تند کا سا اثر کیا ہے جس سے صرف سرور نہیں سرمستی تک نوبت پہونچ گئی ہے تاہم سمجھ میں یہ آتا تھا کہ یہ نمدیدوں کی سی باتیں ہیں یا کبھی کچھ بھی نہ دیکھا تھا یا دیکھا تو اچانک اور

یکایک اور وہ بھی وہ کچھ جو اچھے اچھوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔
طبیعت تھی شاعرانہ تاثرات کو جوش اور رنگینی کے ساتھ موزوں کر دیا مگر ان خطوں سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ اثر عام مناظر کا نہ تھا بلکہ خاص تجلیات کا"

حقیقت تو یہ تھی کہ مولانا پہلے سفر میں حسینانِ زردشتی کے حسن سے مسحور ہو گئے تھے اور اسی کا اثر وخمار دستہ گل کی غزلوں میں ہے، ہندی والے خط میں جس غزل کا ذکر ہے۔ اسی کے دو شعر صاف بتا رہے ہیں۔ متاع کہنہ نرگس پر نثار کی۔

نثار ہمت کن ہر متاع کہنہ و نو را — طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
فغاں از گرمی و ہنگامہ خوبانِ زردشتی — ہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و نور را

اسی تاثر کو ایک اور غزل کے شعر میں دیکھئے

آن نگار مجمی چہرہ بداں ساں انگیخت
کاتش آورد و مہ زور خرمن جانِ زدہ ام

اور اسی زمانہ کے رموز تصوف پر اور غور کیجئے یا اسی موسم بہار کے چند پھولوں کی خوشبو سے مشام دماغ کو معطر فرمائے۔

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال — بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
گو نباد شمن ہم از ذوقش نصیبے بردہ است — بادہ و ملش چشیدم از مذاق افتادہ بود
گرچہ من مرد ہوس بازی و رندی نیستم — ایں چنیں ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود
شب وصل است جا گر بگذاری چہ شود — یک دم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

اگر ایں عقدہ بن باز سپاری چہ شود از تو نا بدگرہ بند قبا را کردن

مصنف شبلی نامہ دستۂ گل کی غزلوں کا یوں تجزیہ کرتے ہیں کہ

"دستۂ گل میں تین طرح کی غزلیں ہیں پانچ ابتدائی غزلیں تو وہ ہیں جو شبلی نے ستمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی میں یا بمبئی سے جاتے وقت لکھیں پھر کئی غزلیں ہیں جو الہ آباد یا لکھنؤ میں لکھی گئیں اور جن میں یا تو بیتے ہوئے لمحوں کی یاد ہے یا کسی مقامی فتنہ گر کی آرزو۔

غزلوں کا زیادہ حصہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۰۶ء میں واپس جاکر لکھا گیا پہلی دو تین غزلیں تو ایسی ہیں جو آسمان بمبئی کے پُر سواد منظر اور اختر و نجوم کی فراوانی کا بیان ہے لیکن چوتھی غزل کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اب اس آسمان پر ماہتاب نمودار ہو گیا ہے اور مولانا کے اشعار عام شاعرانہ جذبات کا اظہار نہیں بلکہ کسی ماہ تمام کی پرستش کے گیت ہیں۔ اس غزل میں مولانا لکھتے ہیں کہ ؎

کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام ہاں مہاں دست بدار بد زمین اے احباب

مقطع میں تو صاف اظہار ہے کہ ؎

سپے تواں برد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست
شبلی ایں تازہ نوا ہا کہ چہ مستاں زدہ ام

محولہ و مندرجہ بالا اشعار میں بلاشبہ مولانا نے تلاطم جذبات میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو مکنونِ خاطر تھا اور واردات قلبی تھی۔ ان اشعار کو سلسلے وار پڑھیے اور پوری غزل دیکھیے جس میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

بیش ازیں گام طلب دررہ حرماں زدہ ام ‏ ‏ ‏ بہ بوزمرامنزل مقصود عبث

اس منزل مقصود پر پہونچکر شاعر دانش وعرفان کے غرور سے تھک کر اپنے دل کی مراد نکالنا چاہتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے جسم پر جامہ زہد موزوں نہیں لہٰذا وہ شیشہ تقوی کو سنداں پر مار دیتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ اے دوست وہ زمانہ گیا جبکہ میں پیکر فن آراستہ کرتا تھا اب تو ورق جاں پر صنم زیبا کی تصویر بنا لی ہے اور اب ہو چکا کہ تو مجھے دوبارہ (یہاں ندوہ میں) دیکھے گا کیونکہ اس دشمن ایمان کی محبت میں مصروف ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دشمن ایمان جلوہ افروز کہاں ہے۔ اور صف عنوانی کے افراد واہمہ ہیں یا حقیقت لیکن اس سے قبل "خطوط شبلی" کی تاریخ بھی سن لیجئے جس میں مصنف کو یہ سامان نظر نہیں آتے، اور جن کی تاریخ آغاز دو برس بعد ۱۹۰۸ء قرار دی گئی ہے۔

عامتہ" لوگوں کے پاس سلسلے دار خطوط محفوظ نہیں ہوتے اور نہ ابتدائی مراسلت کو حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ ان بیگمات (زہرہ بیگم و عطیہ بیگم) کے پاس بھی ابتدائی خطوط محفوظ نہ تھے لیکن ہم کو اس مجموعے کے پہلے خطوط سے ہی ۱۹۰۸ء سے قبل کے تعلقات صاف معلوم ہو جاتے ہیں۔

(۱)" جنجیرہ کے سفر کا جو موقع جاتا رہا اس کا افسوس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے۔ ہمت نہیں ہوتی ورنہ

یورپ کے سفر کا اچھا موقع تھا ..... ندوہ کے انگریزی کاغذات زہرہ بیگم صاحبہ کو دے آیا تھا کہ تم کو دے دیں ..... اگر اس خط کا جواب آیا تو بہت سی ضروری باتیں تم کو لکھی ہیں اکثر تمہارے مشن کے فوائد سے متعلق ہیں"۔ (۷ فروری ۱۹۰۸ء)

(۲) "بے شبہ جنجیرہ نہ آنے کا رنج ہے لیکن اب جنجیرہ کا آنا یقینی ہے اب نہ سہی پھر سہی یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہے کہ ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں ....."

اب دشمن ایمان اور اس کے مقام کو اور وصف عنوانی کے افراد کی حقیقت کو خطوط شبلی اور مکاتیب شبلی میں اگر دیکھئے تو یہ سب کچھ صاف اور روشن تر نظر آتا ہے۔

بمبئی میں خاندان فیضی سے مراسم اور تجدید و توسیع تعلقات

بمبئی میں حسن فیضی صاحب (آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی کے ابن عم) تجارت کرتے تھے اور یہ کاروبار استنبول میں بھی تھا۔ مولانا شبلی جب بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے سلسلہ میں وہاں گئے تو حسن فیضی صاحب نے ہم وطنی کے خیال سے بڑی خاطر تواضع کی تھی۔ اب سالہا سال گذرنے کے بعد لکھنؤ میں مشیر حسن منا قدوائی تعلقدار گدیہ (اودھ) کے یہاں مولانا کی فیضی صاحب کی صاحبزادیوں (زہرہ بیگم نازلی رفیعہ بیگم عطیہ بیگم) سے ملاقات ہوئی اور ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا۔

اس کے بعد ہی سنہ ۱۹۰۶ء میں مولانا بمبئی گئے اور اس خاندان سے تجدید و توسیع تعلقات کا موقع ملا۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں پھر گئے گزند پا کا حادثہ ہو چکا تھا اور مصنوعی پاؤں بنوانا بھی تھا۔ وسط فروری ۱۹۰۸ء میں مراجعت کی۔ اس سہ ماہ قیام میں ایک طرف چوپاٹی اور اپالو کی سیر اور دوسری طرف خاندانِ فیضی[۱] کی صحبتوں نے وہ سرخوشی و سرمستی پیدا کر دی جو دستہ گل کی غزلوں سے ٹپکی پڑتی ہے۔

۱۹۰۸ء میں اپنے حبیب لبیب اور ہم مذاق دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر کو بھی بمبئی آنے کی یوں دعوت دیتے ہیں

" اپالو کی اب ضرورت نہیں جس ہوٹل میں آگیا ہوں وہ خود کوہ قاف ہے۔ آپ بھی آتے تو بڑا لطف ہوتا نہیں تو سب حیدرآباد چلتے..... بہت سی پر جوش غزلیں لکھیں آئے تو سناؤں گا، اسی لئے پرچوں میں نہیں بھیجیں ایک

[۱] اس خاندان میں ایک تو امیر النساء بیگم ایک معمر اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور تین انکی تعلیم یافتہ صاحبزادیاں تھیں۔ ۱۔ زہرہ بیگم بیوہ عمر ۴۲ سال ۲۔ نازلی رفیعہ بیگم (ہر ہائی نس جنجیرہ) عمر ۲۸ سال ۳۔ عطیہ بیگم دوشیزہ عمر ۲۳ سال ان بہنوں کو علمی و ادبی ذوق تھا۔ قومی اور صنعتی مسائل سے دلچسپی تھی۔ دونوں بڑی بہنیں باوقار متین اور پر تمکین تھیں عطیہ کے مزاج میں شوخی اور آزادی تھی۔ یورپ کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ موسیقی آرٹ اور سیاسیات سے خاص لگاؤ تھا۔

غزل کا شعر ہے ؎

این غزل اولِ فیضِ اثرِ بمبئی است
باش تا بادۂ این میکدہ در جوش آید

(۲۱ جنوری ۱۹۰۶ء ش۶۰ بمبئی)

مولانا اب انہیں رنگین اور دلچسپ ادبی صحبتوں میں محو تھے کہ ان کو بمبئی چھوڑنا ناگزیر ہو گیا جس کی نسبت مولانا شروانی کو لکھتے ہیں کہ

"عین اس وقت کہ چمن زارِ بمبئی کی گل گشت نے عالم طلسم میں پہونچا دیا تھا۔ بہاول پور کے عہدہ داروں کا خط پہونچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل ایسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے عدن کو خیرباد کہا تھا، بہرحال پھر اسی خرابہ میں آ گیا۔"

(۱۸ فروری ۱۹۰۶ء ش۷۱ لکھنؤ)

پھر ایک ہفتہ بعد لکھا کہ

"آپ کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔" (۲۶ فروری ۱۹۰۶ء ش۷۲ لکھنؤ)

۱۹۰۸ء کے قیام میں صاحب شبلی نامہ عطیہ بیگم صاحبہ کی قلمی خاندانی ڈائری سے لکھتے ہیں :-

"شروع فروری میں دو مسلم خواتین کا ایک لکچر تھا۔ مردوں میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ..... شریک جلسہ تھے"

ملاحظہ ہو، پیسہ اخبار، فروری ۱۹۰۸ء

اس کے بعد ان خواتین نے ایک تاریخی تماشہ (ٹابلو) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں لیکن افسوس کہ تماشہ کے انعقاد سے پہلے انہیں لکھنؤ جانا پڑا۔

مولانا نے غالباً اسی جلسہ سے متاثر ہو کر شروانی صاحب کو لکھا تھا۔

بمبئی میں تعلیم نسواں کے حیرت انگیز نمونے دیکھے جنس لطیف کے پبلک لکچر اور اسپیچیں سنیں اور پرائیویٹ صحبتوں میں ان کی قابلیت دیکھی۔ تعجب ہوا لیکن چنداں خوشی نہیں۔

(۵۔ مارچ ۱۹۰۸ء ۷۳)

اسی خط کا ایک فقرہ اس بات کی بھی غمازی کر رہا ہے کہ

اب خوبان زردشی کا سحر بھی زائل ہو گیا تھا "ترسا زادے بمبئی کے ایوانِ جمال کے جھوٹے طلسم ہیں۔ سچی تصویریں الگ ہیں۔ عراقی بھی ایرانی بھی غال خال ہندی بھی"

عطیہ بیگم کا سفر یورپ اور وداعیہ نظم

اپریل ۱۹۰۸ء میں عطیہ بیگم نواب اور نواب بیگم خجیرہ کے

ساتھ یورپ اور ٹرکی کے سفر کو جاتی ہیں۔ مولانا پر عجیب واردات گذر رہی ہے اور اسی واردات قلبی کو ردانگی سے قبل ایک خاص انداز سے خطوں میں ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔ بالآخر نوشعر کا ایک وداعیہ ارسال کرتے ہیں

بردی سوئے پیرس ولندن
وزرہ کعبہ وحجاز آئی

اور پھر درخواست ہے کہ

وزپس آمدن بہ اعظم گڈھ
ازرہ لطف بکہ تاز آئی

واپسی کی مبارک باد اور خیر مقدم کی دو رنگی نظمیں

جب واپس آئیں تو مولانا نے عطیہ بیگم کو، اکتوبر کو یہ خط لکھا۔ اہلاً وسہلاً

عزیزی، ایک بے ریا دل ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد قبول کرو۔ میری زندگی کا یہ بخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کی بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے، واقعات ایسے ہیں کہ ایک دن کے لئے یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک نہایت حقیر ہدیہ ہے۔ کیا تم ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو۔ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریسیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبہ سے اتر نہیں سکتا۔ ہاں

یہ سچ ہے لیکن یاد رکھو آفتاب ذرے پر بھی چمکتا ہے۔ میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے، اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں وہ قائمقامی کرے گی آؤ ایک مرتبہ پھر تم کو مبارک باد دے دوں۔ جناب نواب صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں مبارکباد اور تسلیم۔

اور خیر مقدم کی دو رنگی نظمیں لکھیں

مہدی افادی کو بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔
حال میں خیر مقدم لکھا، ۹ اکتوبر کو لوگ بمبئی آگئے لیکن خیر مقدم میں جہاں اصلی رنگ ابھرا تھا، ان پر سیاہی بھردی۔ دو شعر آپ بھی سن لیجئے۔

شیشہ ہائے دل عاشق بچینندہ زراہ
کہ گزندش رسد ار در تہ پامی آید

میز نیند آب بخاک سر راہش کیں کار
شیدۂ ہست کہ از دیدۂ مامی آید

۵۔ اکتوبر

اور عطیہ بیگم کے پاس جو قطعہ بھیجا تھا وہ یہ تھا

نسیم صبح بیاد بہ مردمی پیش آ
سلام بندہ بہ آن خاک آستاں برساں

ز فرط شوق شکیبا نمی تواند شد
رواندار و رنگ دہیں زماں برساں

متاع جاں وہم ار پلئے مزدمی خواہی
وگرنہ لطف بفرما ور ائیگاں برساں

حدیثِ شوق نہ چنداں کہ درمیاں گنجد — ہر آنچہ می توانی ازاں میاں برساں
تصرّفے مکن از پیش خود درو چیزے — چناں کہ با تو گوئیم تو ہم چناں برساں
بہ آستانہ او سر بنہ و ز روئے ادب — درود گو و دعایم زماں زماں برساں
بگو ز من تو بہ اعظم گڑھ آمدن گفتی — بیا و مرتبۂ من بہ آسماں برساں
سلام شوق و دعائے بقائے دولت و جاہ — بہ نازلی و بہ زہرا یگاں یگاں برساں[له]

مولانا کے جذبات کا تلاطم اور کمالات کا اعتراف

اب نومبر ۱۹۰۸ء میں عطیہ بیگم لکھنؤ آتی ہیں۔ یہ زمانہ ندوہ کے اجلاس سالانہ کا بھی ہے۔ مولانا کے دل میں تلاطم برپا ہے۔ مہدی افادی کو لکھتے ہیں:-

---

له:- استاد کی نظم پر شاگرد کی اصلاح۔ یہاں قابل و علاّمہ شاگرد یعنی مصنف حیاتِ شبلی یا ارکانِ دار المصنفین کی اس ستم ظریفی وجرأت پر ماتم کیا جائے یا داد دی جائے کہ اس قطعہ کو تراش خراش کر غزل بنا دیا اور کلیات میں شائع بھی کر دیا پہلے شعر کے اول مصرعہ میں اصلاح کر کے مطلع بنا دیا۔ نسیم صبح بیا راستے بجاں برساں ساتویں شعر کے مصرعہ اولیٰ کو محرّف کر دیا۔ بگو کہ ہر طبق وعدہائے پے در پے

آخری شعر میں تو اصلاح یا تحریف کا کمال ہی کر دیا

سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی
بہ ساکنانِ درِ او یگاں یگاں برساں

بندہ نعمانی کی ترکیب تو شبلی پر ایک ظلم کے مترادف ہے۔

"بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اس سے عمدہ موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزرے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی فرنچ زبان دانی مصوری نقشہ کشی پالیٹکس قوت تحریر آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی، ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو ہیں دیکھنا۔ ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء ۵۲

پھر ۱۲ دسمبر کو لکھا کہ

ندوہ کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام کب کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا۔ اب تک وہ خمار نہیں اترا سو سو طرح چاہتا ہوں کہ اس دام سے دو دن کے لئے چھوٹ سکوں لیکن اور زیادہ اُلجھ جاتا ہوں۔

ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے بالکل عام دنیا کے مخالف ہے۔ یہاں بھی یکتائی کی شان ہے ان کا خیال بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ٹرکی ایک یوروپین طاقت کا

بازیچہ ہے اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں جدید قرض نے اپنی جاں ستانی کا کام انجام دیا ہے۔ اور دیتا جاتا ہے لیکن باوجود اس عبودیت کے اس مسئلہ میں میں اب تک صاحب ایمان نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سیاست اور حسن کا ایک ہی فرمانروا ہو۔ نمبر ۵۳ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ء

ان کمالات کا اعتراف ایک اور خط مورخہ ۳ جون میں یوں کرتے ہیں :-

" آپ میرے جس دوست کے پولیٹیکل خیالات کے قدر دان ہیں اور جس کا حوالہ آپ نے ٹرکی کے موجودہ انقلاب میں دیا تھا اس کے ایک خط (جو ابھی میرے پاس آیا) کے الفاظ ہیں کہ کانفرنس اور مسلم لیگ سخت ڈھکوسلے ہیں۔ بزدل اور جاہل لوگوں کے انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں، اسی قدر یہ بنتے جاتے ہیں"۔ اصل تحریر محفوظ ہے کبھی موقع ہوگا دیکھئے گا، عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کے پالیٹکس کا تماش کھیلا ہے اس کی اورینگ ٹرکی کی نسبت میرے دوست کی رائے صحیح ہے تو شاید کم وقعت فرقہ جدیدہ ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابلِ وقعت ہوگی۔ میں تو بخدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں گو کافر کے منہ سے نکلے ہیں (۵۷)

اس کے بعد اگست میں پھر عطیہ بیگم کے لکھنؤ آنے کی خبر گرم ہوتی ہے تو لکھتے ہیں کہ :-

"دکن کی بجلی پھر لکھنؤ پر گرنے والی ہے"۔ (خط ۱۲ اگست ۱۹۰۹ء)

مگر ستمبر میں مولانا خود ہی عازم بمبئی ہیں اور لکھتے ہیں

"آپ کے احرام جدید کی داد دوں یا رشک کروں۔ ہاں بمبئی جاتا ہوں مگر اس شرط پر کہ خود گاڑی تک آکر لوا لے جائیں، کچھ ایسی بڑی بات نہیں کوئی کیوں رشک کرے"۔

(خط ۱۲ ستمبر ۱۹۰۹ء)

دیکھئے آپ جزیرہ آنے کی اطلاع کس جذبہ سے دیتے ہیں۔

شوق تو از کجا بکجا می برد مرا
نزدیک شد کہ گرد رہ کارواں شوم

تا بمبئی رسیدہ ام و زود تر بود
کز بمبئی بسوئے جزیرہ رواں شوم

جنجیرہ[1] کا سفر اور تاثرات

مولانا کا یہ سفر جنجیرہ کے لئے تھا۔ چنانچہ بمبئی سے جلد روانہ بھی ہوگئے وہاں جو دلچسپیاں رہیں۔ ان کا بیان مولانا کی ہی زبان سے سنئے

۱۵ اکتوبر ۱۹۰۹ء بمقام جنجیرہ

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
خیال روزۂ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلّیٰ میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی

---

[1] جنجیرہ کو جزیرہ بھی کہا جاتا ہے

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مئے و جامِ سبو ہوگی تو کیوں ہوگی
جنابِ نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

جزیرہ سے واپس آنے کے بعد دل و دماغ میں وہاں کی جو یاد اور صحبتوں کا جو اثر لے کر آئے تھے دوسرے ہی دن اس کو لکھکر بھیج دیا۔
۱۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء بمبئی

یادِ صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں
وہ جزیرہ کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوقِ سخن تھا صحبتِ احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامنِ کہسار سب
غیرتِ خلدِ بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچۂ گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہِ مست ساقی اس قدر
خود بخود لب ریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

پھر ایک خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں کہ "جزیرہ کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے"

نمائش الہ آباد میں خاطر تواضع دسمبر ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کی مشہور نمائش ہونے والی تھی۔ عطیہ بیگم وغیرہ بھی جانے والی تھیں۔ مکان کا بندوبست کر رہی تھیں۔ نمائش میں مولانا کا ایک لکچر بھی قرار پایا تھا مگر بیماری کے سبب سے ملتوی ہوگیا۔ اس موقع پر مولانا نے عطیہ بیگم کو لکھا کہ

"آپ مکان کا کیوں بندوبست کرتی ہیں عین نمائش میں مستورات کے ٹھہرنے کا انتظام ہوگا اور فیس بھی کم رکھی ہے باہر مکان اچھا ملنا مشکل ہوگا۔ میرے یہاں کی مستورات سب وطن چلی جائیں گی۔ کیونکہ برادرم اسحٰق کا مکان اس زمانہ میں عام لنگر خانہ ہوجاتا ہے۔ ان کے سیکڑوں ملنے والے ہیں۔ سب انہی کے یہاں ڈھئی دیں گے مجھ کو سخت تردد ہے کہ میں آپ کی مہمانی کا شرف کیوں کر حاصل کروں گا۔ مکان اگر آپ کو مل سکتا ہے تو آپ سے زیادہ ہم لوگ ڈھونڈھ سکتے ہیں اس لئے آج ہی اسحاق کو لکھتا ہوں کہ وہ بھی تلاش کریں۔

آپ اپنے حالاتِ سفر سے مطلع فرمائیے گا کہ میں آپ تک

پہنچنے کا تہیہ کر سکوں، کیا جناب بیگم صاحبہ بھی تشریف
لائیں گی۔" ۲۱ نومبر ۱۹۱۰ء

عطیہ بیگم سیر نمائش کو آئیں اور مولانا بھی اس موقع پر آ گئے اور اگرچہ وہ مہمانی کا لطف حاصل نہ کر سکے لیکن ملاقاتیں ہوتی تھیں اور خاطر تواضع بھی، اس کے متعلق عطیہ بیگم کی ڈائری[1] کا اندراج یہ ہے:-

نمائش الہ آباد دسمبر ۱۹۱۰ء

ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقاتوں کے لئے آتے تھے اور بلاناغہ ایک خوان عمدہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بچارے بڈھے میاں گو کہ پرانی وضع کے ہیں مگر خیالوں کی وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرا سی یہ بات ہوتی

ناگواری

مگر چند ماہ بعد ہی ایک قسم کی ناگواری نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا نے کسی خط میں علی برادرس کے متعلق کوئی حقارت آمیز بات لکھی جو عطیہ بیگم کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے تلخ جواب دیا اس کی معذرت میں مولانا لکھتے ہیں:-

آپ کا غضب آلود خط لا افسوس ہے کہ آپ نے اس کو اور نگاہ سے دیکھا۔ علی گڑھ کی تحقیر مقصود نہ تھی..... بہرحال اگر کوئی غلطی ہوئی تو وہ بدنیتی سے نہیں ہوئی۔ اس قدر برہم ہونا

[1] شبلی نامہ ۲۰۹

میرے لئے موجب رنج و افسوس ہے۔"

امید ہے کہ آپ خط دیکھنے کے بعد غیض و غضب کو دور فرمائیں گے اور قدیم مراسم رہیں گے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۱۰ء

اس کے بعد خط و کتابت جاری رہی مگر وہ جوش نہ تھا اور دیر دیر میں خطوط آنے جانے لگے ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ

"زمانہ ہو گیا آپ کی طرف سے کوئی خبر نہیں۔ آپ نے جو غضب آلود خط کپورتھلہ سے لکھا تھا اس کے بعد توقع نہیں رہی تھی کہ آپ پھر نصیب ہوں گی اور اسی لئے میں بھی چپ ہو کر بیٹھ رہا تھا آپ نے عنایت کی جو پھر یاد کیا۔

میں گرمیوں میں یہاں سے نکلوں گا لیکن معلوم نہیں کہاں جاؤں حجیرہ کی کشش میں ذرا شبہ ہو گیا۔" ۱۲ اپریل ۱۹۱۱ء

مگر ایسی یاد بھی فراموش ہونے لگی۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"ستم ظریفی کو دیکھئے کہ مہینہ بھر بمبئی میں رہیں اور مطلق خبر نہ دی خبر تھی کہ بیگم صاحبہ بھوپال کے ساتھ ولایت جا رہی ہیں اس لئے زہرہ صاحبہ کو لکھا وہ چپ رہیں بہت پتہ لگایا کہ بمبئی میں تم ہو۔ اول تو کچھ پتہ نہ چلا۔ ۶ مئی کے بعد زہرہ صاحبہ کا خط آیا کہ سب لوگ حجیرہ آ گئے۔ اب جا کر یہ خط آیا سبحان اللہ افسوس بمبئی میں بہت رہوں گا لیکن تم سے ملنا محال ہو گیا سمندر پار ہو۔ بمبئی ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء

تصویر تقریب شادی عطیہ بیگم صاحبہ

بائیں سے دھنے کو :— ۱- عطیہ بیگم صاحبہ (دلہن) ۲- مسٹر رحمین فیضی (دلہا)

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لئے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی

آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

(شبلی)

آخر آخر میں سلسلہ مراسلت بھی بند ہو گیا لیکن زہرہ بیگم سے جاری تھا - ۱۹ر فروری ۱۹۱۲ء کو لکھتے ہیں کہ

میں نے عزیزی عطیہ کو لکھا کہاں قیام ہے مگر جواب ندارد آپ لکھئے کہ آپ لوگ آج کل کہاں ہیں اور اپریل میں کہاں قیام ہو گا - میں اپریل کا مہینہ بمبئی میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔

عطیہ بیگم کی شادی اور مولانا پر اس کا اثر

دسمبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ بیگم نے ایک کامل الفن صیہونی (مسٹر رحمین فیضی) سے ان کے قبول اسلام کے بعد شادی کر لی - مولانا بمبئی میں ہی تھے - اس خبر کا جو اثر ہوا وہ "انہیں کے الفاظ میں یہ تھا :-

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل وخوار بنا دیئے گئے - لیکن کیا ۵ ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی جس دن کہ ...[۵۱]... ایک یہودی کو ہاتھ آئی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا اس لئے تو نہیں ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

خیر ع

سُبحہ راز نار کر دست و کند"

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء خط بنام مہدی [۷۶]

---

۵۱ :- مکاتیب میں نقاط ہیں۔

مولانا کی دو رباعیاں اور ایک قطعہ

اگلے سال جب وہ بمبئی گئے تو دولہ دلہن سے اکثر ملاقاتیں رہیں ایک صحبت کا ذکر عطیہ صاحبہ کی ڈائری میں بھی ہے۔

۳ر جون ۱۹۱۳ء

اس شام کو تمام شام مولانا شبلی نے ہمارے ہاں گذاری، انہوں نے ایک رباعی میرے لئے کہی اور ایک رحمین کے لئے عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی

کہا میں نے کیا جاہل ہے یا احمق ہے نادان ہے
بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

(شبلی از زبان سیموئل (رحمین)

ایک مدت سے مجھے شوق ہے تصویروں کا
اس سے بڑھ کر کوئی تفریح کی تدبیر نہ تھی
تھی عطیہ کی بھی خواہش کہ مرقع میں مرے
اور سب کچھ تھا فقط حسن کی تصویر نہ تھی

ایک اور قطعہ بھی اسی دوران میں لکھا قطعہ ؎

کھنچ سکتا جو نہ تھا مجھکو کوئی اپنی طرف — اس لئے مجھکو قرابت سے بہت دوری تھی
آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویریں ہیں — آپ نے کھینچ لیا مجھکو تو مجبوری تھی

اظہار شکر اور صلہ مسٹر رحمین نے ان رباعیوں اور اس قطعہ کا عملی

طور پر اس طرح اظہار شکر کیا یا صلہ پیش کیا کہ مولانا کی ایک ایسی لاجواب تصویر بنائی اور اس میں فن مصوری کا وہ کمال دکھایا کہ نمائش فرانس منعقدہ ۱۹۱۳ء کی آرٹ گیلری میں اس کی بے انتہا قدر کی گئی اور نہایت معقول قیمت لگی مگر اس کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا گیا اور ان کے نگار خانہ میں ایک قیمتی یادگار کے طور پر آویزاں رہی۔

تصویر کی نسبت مولانا کا اشتیاق

اس تصویر کا علم اور تکمیل کا اشتیاق و انتظار خود مولانا کو بھی تھا۔ چنانچہ آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے۔ ابھی پوری تیار نہیں ہو چکی۔ میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔" (۲۰ اگست ۱۹۱۳ء)

اور آزاد ہی کو نہیں بلکہ مولوی سمیع اور مصنف حیات کو بھی اطلاع دیتے ہیں

(۱) ایک مشہور ہندوستان کا دستی مصور جو اپنے کمال فن کو دکھانے کے لئے ولایت جا رہا ہے اس نے میری دستی تصویر اپنے شوق سے تیار کی ہے۔ (سمیع ص ۵۶)

(۲) ایک نہایت استاد آرٹسٹ یہودی نے (جو اب مسلمان ہے) اپنی خواہش سے میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے۔ ابھی پوری تیار نہیں ہوئی۔ آجائے تو اس کا فوٹو لیا جائے[۱] (سلیمان ص ۵۲)

---

[۱] امید تھی کہ حیات شبلی میں اس تصویر کا فوٹو بلاک دیا جائیگا لیکن (باقی صفحہ ۷۶ پر)

آخری زمانہ کی حسرت

اب عطیہ بیگم تو دوسرے مشاغل میں مصروف ہوگئیں اور یورپ کے سفر کو چلی گئیں۔ البتہ زہرہ بیگم سے مراسلت جاری تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جناب بیگم صاحبہ اور عزیزی عطیہ بیگم کو سلام شوق کہئے۔ رحمین صاحب دام لطفہٗ کو بھی،

۲۲ اگست ۱۹۱۳ء

پھر ۲۴ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھا کہ

"میں اپریل سے پہلے غالباً نہ آسکوں۔ اس وقت معلوم نہیں آپ لوگ کہاں ہوں گے۔ جی تو چاہتا ہے کہ کچھ دنوں جزیرہ آکر رہوں اور وہیں تصنیف میں مشغول رہوں۔ افسوس ہے عطیہ نہیں انہوں نے تو یورپ آباد کیا۔

اب مولانا بمبئی گئے مگر جزیرہ میسر نہ ہوا۔ زہرہ بیگم نے قدیم اخلاق برتا عطیہ بیگم بیگانہ نہ رہیں۔ مولانا بھی زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ آخر اگست ۱۹۱۴ء میں اپنے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۰) مصنف حیات شبلی کو اسی زمانہ میں تحقیق ہوا کہ تصویر ناجائز ہے۔ اس لئے کتاب میں کوئی تصویر نہیں دی گئی۔

ہندوستان میں جب سے فوٹو کا رواج ہوا صدہا علما کے فوٹو شائع ہوئے اور ظاہر ہے کہ جب تک کہ خود نہ کھنچوایا جائے اچھا فوٹو نہیں کھنچتا۔ علمائے قدیم میں نواب صدیق حسن خان اور مولوی جمال الدین خاں (بھوپال) نے اور علمائے جدید میں مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید دہلوی اور بہت سے دیگر علما نے جائز رکھا۔

عزیز بھائی مولوی محمد اسحٰق کی علالت سے پریشان ہوکر الہ آباد چلے آئے یہاں ۱۵ اگست کو ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا کی زندگی میں یہ سخت سانحہ تھا، مگر اس عالم میں بھی عطیہ بیگم کے اعظم گڈھ آنے اور تعزیت کرنے کی بڑی آرزو تھی زہرہ بیگم کو لکھا کہ

کاش آپ یا عطیہ کبھی یہاں آتیں اور دس پانچ دن اس ویرانہ میں بسر کرتیں عطیہ اگر آجائیں تو بہت سلام شوق کہئے اور کہئے کاش وہ میرے گھر آکر تعزیت کرتیں کہ دل کو تسکین ہو سکتی۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۱۴ء

مگر یہ تسکین حاصل نہ ہوئی اور مولانا نے اسی حسرت میں ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو رحلت کی۔ (غفرلہ)

خاتمہ داستان یہ داستان مولانا کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے لیکن ان جذبات وخیالات سے جو خاص دوستوں کے خطوط میں ظاہر ہوتے تھے۔ یہ بیگمات بے خبر تھیں، عطیہ بیگم کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ جو قلم ان کو عزیزی[۱] خاتون محترم۔ قرۃ العینی کے تقدیس آمیز الفاظ سے خطاب کر رہا ہے وہی دوسروں کو سلطان جمال اور کافر وغیرہ کے الفاظ سے روشناس کرا رہا ہے اور سفر یورپ اپریل ۱۹۰۸ء کے وقت جو شخص وداعیہ نظم میں یہ دعائیں کرتا ہے۔ ؎

بردی سوئے پیرس ولندن وزرہ کعبہ وحجاز آئی

۱؎:۔ عزیزی، قرۃ العینی کے القاب اپنی لڑکی کو بھی لکھتے تھے۔ (مکاتیب ا)

ہم و آئین شرع نگذاری | رہ روِ جادۂ نیازائی
نکتہ پیرائے علم و فن باشی | تا بہر پایہ سرفراز آئی

وہی مراجعت کے وقت خیر مقدم میں وہ رنگ ابھارتا ہے کہ خود ہی دوستوں تک کے سامنے ان پر سیاہی بھرنے پر مجبور ہوتا ہے اس خیر مقدم کے دو شعر تو آپ نے ہمدی کے خط میں دیکھ لئے پانچ اور بھی دیکھئے

دیدۂ و دل ہمہ دکانِ تماشا چیدند | کاں تماشاکدۂ حسن و ادا می آید
ابروان خنجر و گیسو فرو ہشتہ کمند | ترک شوخیست زمیدانِ دغا می آید
بوئے جانے کہ مشام دل و جاں تازہ کند | می توان یافت کزاں بند قبا می آید
ہر کجا می گزرد عطر فشاں می گزرد | ہر نسیمے کہ ازاں زلف دوتا می آید

شبلی غم زدہ آورد دل و دیں بہ نثار
غیر ازیں چیست کہ از دست گدا می آید

عطیہ بیگم کی تصریحات

خود عطیہ بیگم نے مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی کے عنوان سے جو تصریحات کی ہیں وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں:-

”مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہِ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکانِ سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڈھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں میں ان کا تعارف

بھی کرایا تھا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہوگیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بار ایٹ لاء و تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانہ پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری ہوگیا۔

دوسرے سال ان کے پاؤں میں گولی لگنے کے بعد وہ مصنوعی پاؤں کے انتظام کے لئے بمبئی آئے اور پھر تو بارہا آئے ہم سب سے بے تکلفانہ ملاقاتیں رہیں۔ کبھی کبھی ان ملاقاتوں میں ہمارے خاندان کی اور بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں۔ علمی، قومی سیاسی باتیں ہوتی تھیں، اور سب ہی عورتیں اور مرد ان کی عزت کرتے تھے۔ جنجیرہ میں بھی ان کو مدعو کیا گیا اور ان کے ندوہ کو بھی اخلاقی و مالی مدد دی گئی۔

ان ملاقاتوں میں اب وہ پہلے کے سے مولانا نہ تھے، نہایت آزاد خیال، عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے۔ رسمی و رواجی پردے کے علمی و عملی طور پر مخالف تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ شعر و شاعری اور مہذب لطائف و ظرائف اور خیالات کی

یکسانی سے یہ ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔

غرض ان کی زندگی بھر یہ سلسلہ قائم رہا اور ان کے انتقال کا ہم سب کے عزیزوں کی طرح رنج ہوا ہم نے ان کے خطوط کو جو اس وقت موجود تھے بڑی حفاظت سے رکھا کیونکہ ان خطوں میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔

۱۹۲۳-۲۲ء میں اڈیٹر ظل السلطان محمد امین صاحب زبیری جن سے بھوپال کے توسل سے ہماری ملاقات تھی اور جو مولانا کے بھی بڑے مداح اور دوست تھے بمبئی آئے اور ان سے مولانا کا تذکرہ آیا تو میں نے ان کو وہ خطوط دکھائے۔ اور ان کی درخواست پر ظل السلطان میں اشاعت کی اجازت بھی دے دی۔ اور پھر یہ مجموعہ شائع ہوا۔ اس واقعہ کو سالہا سال ہو گئے مگر اب تھوڑا عرصہ ہوا جب میرے علم میں آیا کہ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلی، کے نام سے شائع کیا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کئے جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کئے گئے۔ اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے۔ مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔

جہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کو ایسے رازدار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں جو مہذب تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لئے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی جو علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیار شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے ان کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیئے تھا کہ اگر ان کے خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے خطوط کی اشاعت گوارا کرتے انہوں نے یہ بھی غور کیا ہوتا کہ خود مولانا شبلی کے اخلاق کے متعلق دنیا کیا رائے قائم کرے گی۔

ہم نے مولانا کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے تھے۔ ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بدگمانی کرتا یا کسی برائی کا احساس ہوتا۔ البتہ بعض میں شوخی ضرور ہوتی تھی جو شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ رمز و اشارات اُن ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی ان کو شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔

میں محمد امین صاحب زبیری کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہماری پوزیشن کو تبصرہ حیات شبلی میں بیان کر کے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت

بنادی۔ واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ
انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ لیکن
نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی اور ہم بھی
اسی علم دلاعلمی میں رہے۔

(ادبی دنیا۔ لاہور جولائی ۱۹۴۲ء) عطیہ بیگم

ابوالکلام آزاد

خاص احباب

شبلی و آزاد کے تعلقات

شبلی کی زندگی میں مولوی ابوالکلام آزاد کے تعلقات کی بھی خاص اہمیت ہے مکاتیب شبلی میں ان کے سو سو مہ خطوط بھی درج ہیں اور حیات شبلی میں بھی ان کا بیان ہے مگر اس میں بھی وہی شیوہ و طرز ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔

آزاد نے اپنے خود نوشت تذکرہ میں اپنی اوائل زندگی کے متعلق لکھا ہے:۔

> ۱۸۸۸ء میں مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا..... عہد طفلی ایک خواب عیش تھا..... آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی..... غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا بہتر ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے..... گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے

اور گمراہی اعتقاد کی الحاد، سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی
جس سے اپنا نامہ اعمال خالی رہا ہو ..... غرض کہ اپنی
غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا لیکن ادھر کارفرمائے غیب کا
فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا ..... ناگہانی جاذبۂ توفیق
الٰہی پردہ عشق مجاز میں نمودار ہوا اور ہوس پرستیوں کی آوارگی
نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہونچا دیا ..... چنانچہ
الحمد اللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی طول نہ کھینچا۔ ایک سال
پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے
دیکھ ڈالے .... جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو
ہمیشہ گریزاں رہا اور شیوہ تقلید و روش عام سے پرہیز، جہاں
کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے
نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں
کے لئے اپنا نقش قدم چھوڑا ..... اپنی شکستگی و خستگی
نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون نہ کسی زبان کی، نہ خاندان کی نہ تعلیم و
تربیت ظاہری کی جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہ عشق سے
پایا ہے ..... ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے
اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی
رندی و ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین
اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنون شباب کی سرمستیوں کا

اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح پنجوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا..... باوجودیکہ اس معاملہ پر کامل نو برس گزر چکے ہیں..... لیکن الحمدللہ جو درد پہلے داغ اور پھر زخم بن کر رہا تھا اب ناسور بن کر نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے۔"

مگر حیات شبلی میں ان کی تربیت کا کریڈٹ شبلی کو دیا گیا ہے۔ یعنی "اکتوبر سے مارچ تک مولانا آزاد دہلوی الندوہ کے رب اڈیٹر تھے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے یہیں انہوں نے مولانا حمیدالدین کے ساتھ کچھ دن بسر کئے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر "الہلال" میں نظر آیا..... مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون مسلمانوں کا ذخیرہ علوم اور یورپ

لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا ....."

یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا۔ اسی قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں :-

"آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا قلم وہی ہے معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں"

اس کے بعد مصنف حیات نے ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر میں جانے اور دو سال بعد باپ کی جگہ سجادہ نشینی اور کلکتہ میں ہدایت و ارشاد میں مصروف ہونے اور ۱۹۱۲ء میں "الہلال" نکالنے کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ :-

لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے۔

(حیات شبلی) ۴۴۴ و ۴۴۵

اب ذرا سے تجزیہ سنین کے ساتھ آزاد کی حالت ملاحظہ کی جائے

الندوہ کا تعلق ۱۹۰۵ء میں ہوا ۱۹۰۸ء سجادہ نشینی اور ہدایت و ارشاد خلق کا زمانہ ہے۔ عین اکیس بائیس سال کی عمر (یعنی ۱۹۰۹/۱۹۱۰) میں انہوں نے الحاد و عشق کی منزلوں سے گذرتے ہوئے اپنی تردامنی کو نچوڑا ہے شیوۂ تقلید و روش عام سے پرہیز رکھا ہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ کی اور اپنی راہ خود ہی نکالی۔

اب دیکھئے کہ ہدایت ارشاد و خلق جنون شباب کی سرمستیوں میں ہوتی ہے جو ممکن نہیں، اپنی تعلیم و تربیت میں خاندان کی منت پذیری سے بھی انکار ہے۔ کانگریس کی ہمرہی میں شبلی کا فیض صحبت بھی قبول نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلم پبلک میں واقعات طرابلس و بلقان کے جوش و خروش نے الہلال کو بہت مقبول بنا دیا تھا اور آزاد متعارف ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۳ء کے اجلاس مسلم لیگ آگرہ میں پہلی بار شریک ہوئے۔ حاضرین کو اپنی تقریر سے متاثر بھی کیا۔ ۱۹۱۵ء میں نظر بند کر لئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں رہائی ہوئی اور نوزائیدہ انجمنوں، خلافت و جمعیتہ العلماء میں نمایاں ہو گئے ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات میں شریک ہو گئے۔ ان واقعات کے بعد عرصہ تک کوئی میدان نہ ملا۔ الہلال کی جگہ البلاغ بھی نکالا مگر کامیاب نہ ہوا۔ دہلی میں ایک علمی مرکز بنانے کی کوشش بھی ناکام رہی۔

۱۹۴۶-۴۷ء میں جب کانگریس نے مسلم عوام سے رابطہ کی مہم شروع کرنی چاہی تو اس نے چند پیڈ ایجنٹوں کی خدمات حاصل کیں انہی میں آزاد بھی تھے۔ جن کا قدم تیز سے تیز تر ہوتا گیا اور انہوں نے مسلم لیگ کی قوت توڑنے میں بڑی کوششیں کیں اور اگرچہ وہ ناکام رہیں تاہم کانگرس نے ایک اہم شخصیت خریدلی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ صدر کانگرس منتخب ہوئے۔ دارالمصنفین اور اس کے رفقا سے قدیم تعلق تھا۔ اس ادارہ کے لئے بھی یہ اعزاز صدارت باعث فخر تھا اور اسی زمانہ میں حیات شبلی مرتب ہو رہی تھی۔ اس میں اتحاد اسلامی اور کانگرس کی ہمرہی کو شبلی کا فیض صحبت تو دکھایا مگر مسلم انڈیا کے اعتماد قطعی زائل

ہونے اور ان کو شو بوائے سمجھے جانے کا اشارۃ" بھی ذکر نہیں کیا۔

حیات شبلی کے مصنف نے مولانا کی خلوت وجلوت کی صحبتوں میں لفظ "علمی" بڑھا کر محدود کردیا ہے۔ حالانکہ اس فقرہ میں "علمی" کے لفظ کی سمائی نہیں وہ صحبتیں غیر محدود اور غیر مفید ہیں۔ مولانا شبلی نے خود ابوالکلام آزاد کو ایک خط امورخہ ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء میں ہر قسم کی صحبتوں کا شریک و مصوب گردانا ہے۔

"ہاں اور سنی افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف
لکھ کر انہیں آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں
اجازت و حالات مانگتے ہیں میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری
حالات تو ہر جگہ مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا
ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوا لیجئے۔ بھئی بتا تو نہ دوگے
ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی   ۳۰ئے

مولانا شبلی کے تعلقات ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتے ہیں جب کہ آزاد سترہ اٹھارہ سال کے بے ریش و بروت نوجوان اور بقول خود غفلت و مدہوشی کے افسوں میں گرفتار تھے۔ اور مولانا شبلی کی اڑتالیس سال عمر تھی عہد شباب ختم ہو چکا تھا مگر یہ تعلقات متقدسین کی نظروں میں کھٹک رہے تھے، چنانچہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں جب ندوہ کے معاملات میں مولانا کے مخالف علماء نے مولانا شبلی کے خلاف فرد جرم مرتب کی تو اس میں یہ تعلق بھی ایک جرم تھا، جس کا بیان خود مولانا نے ایک خط میں کیا ہے کہ "ہاں انہیں جرائم میں

ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔" ۲۲۔ مکاتیب

اس روئداد کو پڑھنے کے بعد ۱۹۱۰ء کے چند خطوط پڑھئے:۔

(۱) ازاں بہ درد جگر ہر زماں گرفتارم
کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

بھائی تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کردی ہے کہ "الیاس احدے الراحتین" لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکہ لگا دیتے ہو خیر جو مرضی یہ بھی منظور۔ کلکتہ گیا ایک خاص کام تھا۔ مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھیرا۔ دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں لیکن ع۔

چہ حظ خضر برد از عمر جاوداں تنہا

۳۔ ۱۵۔ جون ۱۹۰۹ء

(۲) بے شبہ میری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں ایسی حالت میں ایک تصنیف بھی انجام پا جائے لیکن مسلسل دن رات تو وحشت کدہ میں بسر نہیں ہو سکتی۔ شیعوں کے عملی فلسفہ کی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء

(۳) برج خاکی پر قبضہ ہو جائے تو لکھے گا۔ ہاں ایک روایت تھی کہ ماہ تمام بنگال کے اُفق پر نکلا۔ تلاش سے شاید پتہ لگ جائے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء

(۴) برادرم اچھا کہیں نہیں جاؤں گا۔ بندہ را فرماں بناشد ہرچہ فرمائی برآنم

لیکن کیا شبلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہے۔ لیس الذکر کالانثیٰ

ماسٹر دین محمد دلمن گئے تھے۔ سخت جانگزا خبر لائے یعنی بدر کامل حیدرآباد سے دہلی پہونچکر غروب ہوگیا۔ مرتبۂ ابراہیمی کہاں سے ہاتھ آئے کہ لا احب الآفلین کہہ سکوں۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء

کیا یہ خطوط شبلی کے چہرہ پر کھلتے ہیں کیا شیعوں کا عملی فلسفہ اور برج خاکی پر قبضہ کا انتظار متعہ کی خواہش نہیں جو تھے خط کی تصریح ناظرین خود ہی کرلیں۔

مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی صدر یار جنگ

حیات شبلی کی ایک خصوصیت

ایسی ہے جو غالباً آج تک کسی تصنیف کو نصیب نہیں ہوئی۔" نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی سے بھی نہ صرف تحقیق واقعات میں مدد ملی بلکہ انہوں نے کتاب کے مسودہ کو حرف حرف پڑھا اور اس طرح مصنف کے بیان پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے توثیق کی" ۸۰۲ صفحہ

جناب موثق نے کتمان حقائق کا ارتکاب کیا، اور جو باتیں ان کے علم میں تھیں اور مکاتیب وخطوط شبلی کے مرقع میں نظر سے گذر چکی تھیں ان سے اعراض کیا خود ان کے نام کے مکاتیب میں بھی وہ حقائق موجود ہیں۔

موثق حیات نے آزاد (ابوالکلام) کو ایک نامہ محبت فروری ۱۹۱۳ء میں لکھا ہے کہ

"شبلی اور شروانی کی زندگی کچھ اس طرح منوط رہی ہے کہ

جہاں علامہ کا فضل زر افشاں ہے وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ ریز ہے"۔ نغمہ ختم ہے مگر اس نور و جلوہ میں ع

"ما و شبلی ہم سبق بودیم در بستان عشق"

بھی نظر آ رہا ہے اور اس منوط زندگی میں ایک کی زندگی طربیہ اور قسمت میں عیش و کامرانی اور دوسرے کی المیہ اور نصیب میں حسرت و نامرادی اول تو کہ ایک کے ساتھ قدرت کی یہ فیاضی کہ علم، دولت، وجاہت کے ساتھ عشق و محبت میں کامیابی۔ دوسرے کے ساتھ علمی فضیلت اور باقی سب ہیچ۔ دیکھئے حسرت نصیب شبلی نے اپنی بے نصیبی کو کس طرح ظاہر کیا ہے:۔

"باقی غزلیں بھیجئے اور اگر دیوان پورا کرنا منظور ہے تو وصال کی تاریخ ٹالتے جائیے ورنہ وہ ناسور بند ہو جائے گا ایک ہم بے نصیب ہیں کہ (مصرع)
سرما بگذشت و این دلِ زار ہمہ الخ" ۲۹ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۱ء

مولوی الطاف علی بی اے بریلوی جن کا شروانی سے ۲۰ سال سے بہت قریبی تعلق رہا ہے رسالہ "العلم" کراچی ۱ جلد ۱ ان کے فارسی کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت لطیف پیرایہ میں ہمارے بیان کی یوں توثیق کرتے ہیں کہ:۔

موصوف کو شعر و ادب سے فطری ذوق تھا اور اسی ذوق کے ماتحت کسی خاص تحریک یا جذبہ سے متاثر ہو کر احیاناً فکر شعر فرماتے تھے۔ آپ کے یہاں رفعتِ خیالات و صدقِ جذبات کے ساتھ لطافتِ بیان و سلاستِ زبان کی کمی نہیں ......

نواب صاحب کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب اگرچہ حسن مجاز کا پیکر اور گوشت پوست کا واقعی انسان ہے لیکن جمال ظاہر کے ساتھ کمال معنی سے آراستہ ہے اسی کے ساتھ خود ان کا جذبہ محبت بھی پاکیزگی اور وفا پرستی کے اوصاف سے متصف ہے۔"

خود شروانی نے ناسور بنا ہو جانے کے بعد نقش وفا کی "نقاشی" کی اور دو ہستیوں کے قالب میں حسن و عشق کا "مرقع" بنایا۔ ۵۱

"اپنے بانٹنے بدکر قسام ازل نے اُن کو اپنی فیاضی سے جمال صوری، دولت دنیاوی اور خزینۂ علمی سے بہرۂ وافر عطا کیا تھا لیکن ان کے مناط زندگی (شبلی) کو بجز دولت علمی اور کوئی ایسی چیز نصیب نہ ہوئی جو ان کی زندگی کو طربیہ بنا سکتی۔ یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ باوجود ان اعتراف کمالات کے جو عطیہ بیگم کی نسبت شبلی کے خطوط و مکاتیب میں ہیں۔ مولانا شروانی نے ان کے ساتھ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نفرت ہی ظاہر کی۔

۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی کی جبلی کی شاندار تقریب کے موقع پر ایک زنانہ کانفرنس بھی زہرا بیگم فیضی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ہر حصۂ ہند کی خواتین شریک تھیں عطیہ بیگم فیضی کی موجودگی نے خاص سرگرمی پیدا کر دی تھی جبلی پنڈال میں خواتین کے لئے پردہ دار حصہ تھا چنانچہ جبلی کی تقریب میں خواتین نے بھی شرکت کی۔ جبلی کے جلسوں کے بعد اسی پنڈال میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

۵۱:۔ یہ دونوں کتابیں شروانی کی عاشقانہ زندگی کی داستان ہیں۔

کانفرنس کا اجلاس بھی منعقد ہونے والا تھا مگر ایک دن پہلے مولانا شروانی نے سیکرٹری کانفرنس کی حیثیت اور اختیار سے اعلان کرادیا کہ خواتین کو شرکت کی اجازت نہیں۔ پنڈال میں پردہ کا انتظام درہم برہم کردیا گیا اور کرسیاں الٹا دی گئیں لیکن عطیہ بیگم کی قیادت میں خواتین کا ایک مجمع پنڈال میں داخل ہوگیا۔ قائد خاتون نے اجڑے ہوئے حصہ کے دروازہ پر ایک پرجوش تقریر شروع ہی کی تھی کہ صدر اجلاس (نواب سر عبدالقیوم خاں پشاور) نے کچھ مرعوب اور کچھ متاثر ہوکر اسٹیج پر آکر تقریر کی دعوت دی۔

یہ نظارہ بھی کیسا عجیب تھا کہ چیرز کی گونج میں عطیہ بیگم اسٹیج پر آئیں اور مولانا شروانی آنریری سکرٹری کی کرسی چھوڑ کر تیر کی طرح پنڈال سے باہر فتح و شکست کا پرلطف نظارہ، مگر یہ فتح نتیجہ خیز اور مستقل ثابت ہوئی دوسرے ہی سال ۱۹۲۶ء میں مولانا شروانی آنریری سکرٹری نے اجلاس منعقدہ دہلی میں عطیہ بیگم کا بذات خاص خیر مقدم کیا اور پھر تو خواتین نہ صرف عام اجلاسوں میں شریک ہوئیں بلکہ کانفرنس کی مجلس عاملہ میں ہم جلیس نظر آنے لگیں۔

اب دوسرا ورق الٹئے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ مسلم لیگ اور کانگریس میں انتہائی زور آزمائی کا ہے۔ اسی دوران میں حیات شبلی کے خاص رفیق ابوالکلام آزاد صدر کانگرس ہوتے ہیں اور مسلمانوں کا سواد اعظم ان سے بیزار ہے۔ انہیں کانگرس کے شوبوائے (گڈے) کا غیر فانی لقب بھی مل چکا ہے۔ قائد اعظم جب کبھی علی گڑھ آتے ہیں تو ان کا قیام شروانی کے قصر عجیب منزل میں ہوتا ہے اور اس کے کنگرہ پر لیگ کا ہلالی پرچم لہراتا ہے

مولانا شروانی اس قیام کو ایک مایۂ فخر سمجھ کر پھولے نہیں سماتے۔ مگر اسی زمانہ کے جو خطوط شروانی نے آزاد کو لکھے ہیں وہ الفت و شوق کا دفتر ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی جگہ حلقۂ ارباب ذوق کراچی کے ایک رکن نے ان خطوط پر جو تبصرہ کیا ہے اس کو پیش کر دینا زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔

نواب صاحب کبیر السن اور محترم بزرگ ہیں مگر ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخوخیت نے ان کی طبیعت کو افسردہ نہیں کیا اور ابھی تک شباب کی رنگین طبعی ان میں موجود ہے ان کے دونوں خطوط کا انداز تعشق آمیز ہے پہلے خط میں انہوں نے مولانا کے لئے بدر کامل اور پیکر محبوب کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور مولانا کے مکتوب گرامی کو ترانہ محبت کے حسین الفاظ سے یاد کیا ہے۔ دوسرا خط منظوم ہے تین اشعار ملاحظہ ہوں:۔

محو نظارہ گل رخ کہ نگارے دارم	کہ خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گہ بحضورش گذری	عرضہ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم
در بر سد کہ مگر شوق پیامے دارد	سر فرود آر ز من گوے کہ آرے دارم

مولوی اجمل خاں کے قول کے مطابق مولانا سے ۱۹۰۶ء سے دوستی ہے جب کہ مولانا کے دور شباب کا آغاز تھا اور مولوی صاحب کے الفاظ میں ایک کم چالیس برس (۱۹۴۶ء میں ایک اوپر چالیس برس) اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گذر چکے ہیں[۵] (صفحہ ۱۳۵ - نئی تحریریں)

---

[۵]:۔ یہ موثق جناب شبلی ہیں، جن کی شہرت اور جن کے نام سے مصنف حیات نے سید اور علی گڑھ پر حملوں کی آڑ لی ہے۔

قسامِ ازل نے ان کو اپنی فیاضی سے جمال صوری، دولت دنیاوی اور خزینہ علمی سے بہرۂ وافر عطا کیا تھا۔ لیکن ان کے مناط زندگی (شبلی) کو بجز دولت علمی کے اور کوئی ایسی چیز نصیب نہ ہوئی جو ان کی زندگی کو طربیہ بنا سکتی۔

افسوس ہے ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء کو نواب صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی یادگار میں علی گڑھ کے اخبار "جمہور" نے ایک خاص نمبر بھی شائع کیا ہے جس میں ان کے متعلق مشہور اہل قلم کے تاثرات شائع کئے ہیں۔ لیکن کس قدر ظلم ہے کہ ان کی طربیہ زندگی کا جس میں ایک خاص قسم کی تقدس بھی شامل ہے کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی اور نہ ان کی شریک زندگی کا جو ایک نہایت قابل اور مضمون نگار خاتون ہیں کوئی تاثر شامل کیا گیا ہے۔

چند اور خطوط موسومہ مہدی

مہدی افادی کے نام کے چند خطوط تو عطیہ بیگم کے ذکر میں آچکے ہیں چند اور بھی قابل ملاحظہ ہیں:۔

(۱) اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے دیکھئے گا۔ البتہ جا بجا غلط چھپی ہے کافروں کا ذکر اس میں بھی ہے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء

(۲) بمبئی میں بڑی دل چسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں دو صفحے ہو گئے تو چھپنے کو دیدئے۔ اس میں کچھ پہلے سال کا بھی حصہ ہے بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئی ہیں۔ شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرہ پر نہ کھلیں لیکن حافظ تو کہتے ہیں کہ ع ہر گہ کہ یاد روے تو کردم جواں شدم۔ ایک پرانا تجربہ کار

کہتا ہے کہ عشق در ہنگام پیری چوں بہ سرما آتش است۔ کیا یہ فلسفہ صحیح ہے۔ ابھی نہیں پندرہ برس کے بعد جواب دیجئے گا۔" ۲ر مارچ ۱۹۰۸ء

(۳) شعر العجم کا دوسرا اور تیسرا حصہ بھی قریب الختم ہے ۲۷۰ صفحے کی کاپیاں مطبع سے آچکیں اور لکھتا لیکن ایک جنسِ لطیف کا خط سامنے ہے اور جواب لکھنا ہے۔

اس فرعونیت کو دیکھئے کہ ان شاہنشاہوں کو بھی ابتداً نہیں لکھنا پھر آپ کو شکایت کا کیا موقع۔ ۲۵ر اگست ۱۹۰۸ء

(۴) مدت کے بعد آپ کے دربار میں حاضر ہوتا ہوں بمبئی سے اب کے خالی ہاتھ آیا، ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہو سکا۔ اس شکایت میں ایک غزل لکھی ہے وہ بھی وہاں سے نکل کر مقطع یہ ہے ؎

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل و دیں باخت ایں حرف ولے مصلحت آمیز نبودہ است

ندوہ کی طرف سے اطمینان ہوا اور اب چاہوں تو ایک آدھ مہینے باہر رہ سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ سہی برابر سرابر تو ہو، کیا امید ہو سکتی ہے۔ ۴ر دسمبر ۱۹۰۹ء[لہ] اب سلسلہ وار دیکھئے کہ (۱) یہ کافر کون تھے جن کا ذکر غزلوں میں ہے (۲) وہ کیا دل چسپیاں تھیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں (۳) جنس لطیف کون ہے جس کا خط سامنے ہے۔ شہنشاہ کون ہیں جن کے ساتھ فرعونیت برتی جارہی ہے (۴) بمبئی میں وہ کون ہے جس کے نعم البدل کی تلاش ہے:

لہ: اس خط کے جواب میں مہدی لکھتے ہیں: "پہلے پرچہ میں سکرانے پر جو کچھ لکھا ہے۔ بمبئی والی کو پیش نظر رکھیے لیکن اس دفعہ آپ کا رنگ وہاں کچھ پھیکا رہا کیونکہ آپ نعم البدل ڈھونڈتے ہیں وہ الہ آباد میں موجود ہے لیکن جب تک آپ پردہ کا گلا نہ گھونٹیں اگر وہ آنکھوں میں نہ

آئے تو میرا ...

8

LAMIC
0
5
2